ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

تصانیف: ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

۱	اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام		۱/۵۰
۲	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	ادنیٰ اعلیٰ	۳/- ۴/-
۳	راہِ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں	مفصل مختصر	۳/- ۲/-
۴	دعوت الی اللہ		۱/۵۰
۵	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت	ادنیٰ اعلیٰ	۳/- ۴/-
۶	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	ادنیٰ اعلیٰ	۲/ ۳/-
۷	قرآن اور امن عالم		۱/۵۰
۸	علامہ اقبال اور ہم		۲/-
۹	عظمت صوم		۲/
۱۰	قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ		۱۰/-
۱۱	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب		۱۲/-
۱۲	عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی		۳/-
۱۳	سرافگندیم		۲/
۱۴	مطالبات دین		۹/-
۱۵	تحریک جماعت اسلامی	ادنیٰ اعلیٰ	۱۰ ۲۰
۱۶	شہید مظلوم	ادنیٰ اعلیٰ	۳/ ۴/
۱۷	اسلام اور پاکستان		۵/-
۱۸	تنظیم اسلامی کی دعوت		۴/-
۱۹	سانحہ کربلا		۳/-
۲۰	رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم		۶/-
۲۱	مسلمانوں کے فرائض دینی اور اسوۂ رسول ﷺ		۹/-
۲۲	معراج النبی ﷺ		۳/-
۲۲	اسلام میں عورت کا مقام		۱۰/-

عربی ترجمہ:

۱	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن؟	۵/-

فارسی ترجمہ:

۲	دین قرآن بر گردن مسلمان	زیر طبع

انگریزی تراجم:

۳	The Obligations Muslims owe to the Quran.	۵/-
۴	The way to Salvation—in the light of Surah Al-'Asr.	۵/-
۵	Islamic Renaissance—The Real Task Ahead.	۳/-
۶	The Quran & World Peace.	۳/-
۷	Rise & Decline of Muslim Ummah.	۵/-

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے پی۔ ایچ ڈی۔ ڈی لٹ (مرحوم)

ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ

مطابق اگست ۱۹۸۶ء

جلد ۵ . شمارہ ۸

❋

مدیر اعزازی

ڈاکٹر ابصار احمد

(ایم اے، ایم فل، پی ایچ، ڈی)

معاون مدیر

حافظ عاکف سعید

(ایم اے، فلسفہ)

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن، فون ۸۵۲۶۱۱

زر سالانہ ۳۰ روپے

اس شمارہ کی قیمت ۳ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس

حرف اول ——— ۲

عاکف سعید

الٓمّٓ (سورہ روم) ——— ۵

ڈاکٹر اسرار احمد

درس حدیث (معاملات میں جبلی تقاضے) ——— ۱۲

ریاض الحق

تعارف مہمان مقرر ——— ۱۵

(مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

پروفیسر محمد اسلم

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) ——— ۲۱

سیرت، شخصیت اور علمی و عملی کارنامے

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

تصوف کی حقیقت (۲) ——— ۴۹

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام (۱۴) ——— ۵۵

مولانا محمد طاسین

نقد و نظر ——— ۶۳

(۱) مزید اشکالات

(۲) قرآن عظیم کی زبان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

انجمن خدام القرآن کا قیام ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ انجمن کے قیام کی ضرورت یوں محسوس ہوئی تھی کہ والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۶۸-۱۹۶۷ء سے لاہور میں دعوت رجوع الی القرآن کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے لاہور کے متعدد مقامات پر درس قرآن کے حلقے قائم کیئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دعوتی کام کو پھیلانے کے لئے نہ صرف یہ کہ وہ "میثاق" کے نام سے ایک ماہنامہ باقاعدگی سے نکال رہے تھے بلکہ علمی و دعوتی لٹریچر کی اشاعت کے لئے "دارالاشاعت الاسلامیہ" کے نام سے ایک طباعتی ادارہ بھی انہوں نے قائم کیا تھا۔ کئی برس تک یہ تمام تر کام انفرادی سطح پر ہوتا رہا لیکن ۱۹۷۲ء میں جب اس کام نے خاصی وسعت اختیار کر لی تو ضرورت محسوس ہوئی جو لوگ اس دعوت رجوع الی القرآن سے متفق ہوں اور اس میں تعاون کے خواہش مند ہوں وہ مل جل کر ایک انجمن کی تشکیل اختیار کریں تاکہ یہ کام مزید تیز رفتاری سے آگے بڑھ سکے، مزید برآں طباعت و اشاعت کا تمام کام بھی انجمن کی سطح پر ہو تاکہ کسی فرد کی ذاتی منفعت یا نقصان کا سوال ہی خارج از بحث ہو جائے۔

انجمن کی تشکیل کے موقع پر جو اغراض و مقاصد طے پائے تھے، اور بلاشبہ ان کی تعیین میں انجمن کے صدر مؤسس ہی کی سوچ اور فکر کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی، ان میں ایک ایسی قرآن اکیڈمی کے قیام کا منصوبہ نہایت واضح الفاظ میں موجود تھا جہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ شدہ ذہین اور صاحب صلاحیت لوگ آکر دینی تعلیم حاصل کریں، قرآن کو اپنے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کا موضوع بنائیں اور اس دور کی علمی سطح پر ہر شعبہ علم کے ضمن میں قرآن کے حکم و معارف کو پیش کریں ـــــــ اس طرح کے کسی منصوبے کا تصور ہمیں اس سے قبل علامہ اقبال کے ہاں ملتا ہے۔ جنھوں نے پٹھان کوٹ میں دارالسلام کے نام سے ایک مرکز حاصل کر کے وہاں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن عمر نے انھیں مہلت نہ دی اور ابھی وہ اس منصوبے کی تیاری میں تھے کہ سفر آخرت در پیش آگیا ـــــــ علامہ مرحوم نے اپنی حیات کے آخری دور میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو دعوت دی تھی کہ وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دارالسلام کو اپنا مرکز بنائیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم علامہ ہی کی دعوت پر پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے۔ مولانا مودودی مرحوم کے ایک مضمون سے، جو ان کی وفات کے بعد ہفت روزہ "ایشیا" نے

شائع کیا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کے ذہن میں بھی اس قسم کا نقشہ پہلے سے موجود تھا اور انھیں بھی اس نوع کے علمی کام کی اہمیت کا بھرپور احساس تھا۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر، جن کا تذکرہ اس مضمون میں موجود ہے، مولانا اس کام کو آگے نہ بڑھا سکے۔ تاہم علمی کام کے ضمن میں مولانا مرحوم کے ذہن میں جو خاکہ تھا وہ پوری تفصیل سے اس مضمون میں موجود ہے۔ مولانا کے مضمون کا مکمل متن انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں شامل کیا جائے گا۔

الحمد للہ کہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام مجوزہ قرآن اکیڈمی تعمیر کے مرحلے سے گزر چکی ہے اور اب تعلیمی و تدریسی کام کا باقاعدہ آغاز ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بیچ (BATCH) نے قرآن اکیڈمی کی فیلوشپ سکیم کے تحت دینی تعلیمی نصاب کا ایک حصہ مکمل کر لیا ہے اور اب دوسرے BATCH کے لئے داخلے کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ پہلے دو سال کے نصاب میں مضبوط بنیادوں پر عربی زبان کی تحصیل کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن کے ذیل میں قرآن حکیم کے منتخب حصوں سے مجموعی طور پر دو پارے، حدیث کے ضمن میں مشکوٰۃ المصابیح، فقہ میں 'نور الایضاح'، اصول فقہ میں 'نور الانوار' اور منطق کے ذیل میں 'مرقاۃ' کو شامل کیا گیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ باہمت نوجوان اپنے دنیاوی کیریئر کو نظر انداز کر کے خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ کو بطور آئیڈیل اپنے سامنے رکھیں اور اقبال کے اس شعر کا مصداق بن جائیں کہ ؎

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز!

زیر نظر شمارے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بارے میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ایک معلومات سے بھرپور جامع خطاب شائع کیا گیا ہے۔ اس خطاب سے مولانا مرحوم کی زندگی کے کئی ایسے اہم گوشے سامنے آئے ہیں جو ابھی تک پس پردہ تھے۔ مولانا سعید اکبر آبادی نے حالیہ محاضرات قرآنی کے موقعہ پر مذکورہ بالا خطاب ارشاد فرمایا تھا۔ مولانا کے خطاب سے قبل ان کے داماد نے جو پنجاب یونیورسٹی میں ہسٹری کے پروفیسر ہیں، مولانا اکبر آبادی کی ہمہ پہلو اور ہمہ صفات شخصیت کا تعارف تحریری شکل میں پیش کیا تھا۔ قارئین کی دلچسپی کی غرض سے اسے بھی شامل اشاعت کر دیا گیا ہے ـــــ 'مروجہ نظام زمینداری اور اسلام' کی ایک قسط ابھی باقی ہے جو آئندہ شمارے میں شائع کر دی جائے گی۔ مولانا طاسین صاحب کے اس مفصل تحقیقی مقالے کے ضمن میں جناب محمد اکرم خان ڈائریکٹر کمرشل آڈٹ نے کچھ سوالات اٹھائے تھے جو حکمت قرآن کے ستمبر ۸۳ء کے شمارے میں شائع کئے گئے تھے۔ مولانا طاسین صاحب کی جانب سے اس کا جواب بعنوان 'توضیح اشکالات' مارچ ۸۴ء کے شمارہ میں شائع کیا گیا۔ محمد اکرم صاحب نے اس پر مزید اشکالات پیش کئے۔ انہیں بھی اس توقع پر شائع کیا جا رہا ہے کہ مولانا طاسین صاحب اس کی وضاحت بھی پیش فرمائیں گے تاکہ بحث مزید کھل کر سامنے آئے ★

سلسلہ تقاریر الٓمّٓ

سُورہ رُوم

ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم! نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ہ

اما بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ   بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۭ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ
بَعْدُ ۭ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰہِ ۭ یَنْصُرُ مَنْ
یَّشَاۗءُ ۭ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۙ

آمنت باللہ صدق اللہ العظیم۔

قرآن حکیم میں سورۃ عنکبوت کے فوراً بعد سُورۃ رُوم آتی ہے۔ یہ سورہ مبارکہ ۶۰ آیات اور ۶ رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کا آغاز بھی حروف مقطعات "الٓمّٓ" سے ہوتا ہے۔ اور اس کے فوراً بعد چند آیات میں ایک تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ بھی ہے اور مستقبل کے بارے میں ایک بہت اہم پیشین گوئی بھی جو تھوڑے ہی عرصہ میں حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اور اس طرح گویا کہ قرآن مجید کے مُنَزَّل مِنَ اللہ ہونے کا ایک ثبوت ہے کہ جو فوری طور پر مہیّا ہو گیا۔ اس تاریخی واقعہ اور اس پیشین گوئی کو سمجھنے کے لئے کچھ تاریخ کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بعثت کے وقت عرب کے مشرق اور شمال مشرق اور مغرب اور شمال مغرب میں کئی سو سال سے دو عظیم مملکتیں قائم تھیں - یعنی سلطنت فارس اور سلطنت رُوم - اور کئی صدیوں سے تاریخ گویا کہ ان دونوں کے مابین جھولا جھول رہی تھی کہ کبھی رومی پیش قدمی کرتے تھے اور ایرانی پیچھے ہٹ جاتے تھے اور کبھی ایرانی آگے بڑھتے تھے اور رومیوں کو پیچھے دھکیل دیتے تھے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا آغاز سن ۶۱۰ عیسوی میں ہوا - اور اتفاقاً عین اسی سال ہرقل کی تاجپوشی ہوئی بحیثیت قیصر روم - پھر دو تین سال بلکہ یوں کہئے کہ سن ۴ نبوی تک ادھر تو مکّے کی سرزمین میں یہ صورت حال واقع ہوگئی جس کا ذکر سورۂ عنکبوت میں آچکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والے اہل ایمان شدید قسم کے مصائب سے دوچار تھے - اور کفار کی طرف سے شدید قسم کی PERSECUTION کا انہیں سابقہ تھا - ادھر ہرقل کو بھی ایران کے والی خسرو پرویز کے ہاتھوں پے درپے شکستیں ہوئیں - یہاں تک کہ سن ۶۱۴ عیسوی میں خسرو پرویز نے بیت المقدس کو بھی فتح کر لیا - ہیکل سلیمانی کی بے حرمتی ہوئی - اور مزید یہ کہ وہ اصل صلیب جس پر عیسائیوں کے خیال کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دی گئی تھی، اسکو بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ گویا کہ رومیوں کے لئے ان کے زوال کا ایک نقطۂ عروج تھا یہ ہے وہ وقت جب کہ یہ آیات مبارکہ نازل ہو رہی ہیں -

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ
سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ڛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ
بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ

"رومی مغلوب ہو گئے ہیں قریب کی سرزمین میں اور وہ عنقریب چند ہی سالوں میں پھر غالب آجائیں گے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اختیار مطلق پہلے

بھی اور بعد میں بھی اور اس وقت اہل ایمان کو بھی ایک خوشی حاصل ہوگی"۔
اس میں گویا کہ ایک طرف رُومیوں کی مغلوبی کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف
ایک پیشگوئی ہے کہ چند ہی سال کے اندر اندر پانسا پلٹ جائے گا اور رُومی
ایرانیوں کو شکست دیں گے - یہ بات جان لینی چاہیئے کہ رومی عیسائی تھے اور
ایرانی آتش پرست تھے - ایک طرف تو وہ کشمکش تھی جو ان کے مابین جاری
تھی اور ایک کشمکش یہاں سرزمین مکّہ میں جاری تھی ایک طرف آنحضور صلی اللہ
علیہ وآلہٖ وسلم تھے اور دوسری طرف مشرکین قریش تھے -

اب ظاہر بات ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور اہل ایمان کو ایک
گونہ مناسبت حاصل تھی حضرت مسیح علیہ السلام کے نام لیواؤں سے اور مکّہ
کے مشرکوں کو ایک مناسبت حاصل تھی آتش پرستوں سے - لہٰذا جب ایرانیوں
کو فتح ہوئی تو یہاں مکہ میں مشرکوں نے بغلیں بجانی شروع کر دیں اور مسلمانوں
کو طعنے دیتے کہ تمہارے ساتھ مناسبت رکھنے والے، تمہارے ایک پیغمبر جن کو تم
بھی مانتے ہو کہ وہ اللہ کے رسُول تھے - ان کے نام لیوا مغلوب ہو گئے ہیں - یہ
بات یقیناً مسلمانوں کے دل شکستگی کا ایک سبب بنی - اس وقت یہ آیات
نازل ہوئیں تسلّی و تشفی کے لئے کہ پانسہ جلدی ہی پلٹ جائے گا - چنانچہ
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ان آیات ہی کی بنیاد پر اُمیّہ ابن
خلف سے شرط کر لی کہ تین سال کے اندر اندر رومی ایرانیوں کو شکست دے
دیں گے - حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں قرآن مجید میں "بِضْعِ سِنِیْنَ" کا لفظ
آیا ہے - اور بِضْعٌ کا لفظ عربی زبان میں نو تک کے عدد پر بولا جاتا ہے -
لہٰذا ۹ سال کی شرط کرو -

اب دیکھئے تاریخ کا رُخ - اِدھر تو سن ۶۱۲ء میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ
وسلّم نے مکّہ سے ہجرت فرمائی اور آپؐ مدینہ تشریف لے آئے - اُدھر ہرقل نے
پوری تیاری کے ساتھ جوابی حملہ کا آغاز کیا - اور دو ہی سال کے اندر اندر ادھر

میدان بدر میں اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان کو ایک شاندار فتح عطا فرمائی - اور اُدھر ہرقل آذربائیجان کی طرف سے ایران میں داخل ہوا اور زرتشت کا جو مقام پیدائش ہے، رمیا، اس میں جو مجوسیوں کا سب سے بڑا آتشکدہ تھا، اس نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی - گویا کہ تاریخ نے بالکل ایک مکمل کروٹ لے لی - اہل ایمان کے لئے بھی خوشی اور مسرت کا وقت فتح بدر کی صورت میں اور ان سے نسبی تعلق رکھنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیواؤں کے لئے بھی ایک انتہائی شاندار فتح -

یہ تھی وہ پیش گوئی جو ۹ سال کے اندر اندر پوری ہو گئی - چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ۱۰۰ اونٹ وصول کئے - امیہ ابن خلف سے اور چونکہ شرط کی حرمت وارد ہو چکی تھی لہذا ان کو صدقہ کر دیا گیا -

اس واقعہ کے علاوہ اس سورۃ مبارکہ میں جو اس کا اصل مضمون ہے وہ

التذکیر بآیات اللہ

ہے - یعنی اس کائنات میں ہر جہار طرف مظاہر فطرت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اللہ کی توحید، اللہ کے کمال قدرت، اللہ کے کمال علم، اللہ کی کمال حکمت کی جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کے حوالہ سے ایمان باللہ کی دعوت ـــــ یہ اس سورۃ مبارکہ کا اصل مضمون ہے - چنانچہ اس سورۃ کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں چند آیات آفاقی و انفسی دی گئی ہیں جن میں سے چھ آیات وہ ہیں کہ جو وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں - یہ مظاہر و مشاہدات بھی اللہ کی آیات میں سے ہیں -

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ... "اور اس کی آیات میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا فرمایا ....."

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا ..... "اور اسکی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے

بنائے ....''

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ... ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی ....''

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ .... ''اور اس کی نشانیوں میں تمہاری رات کی نیند بھی ہے اور پھر دن بھی ....''

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا ... ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی ....''

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ ط .. ''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں ...''

(آیات ۲۰-تا ۲۵)

ان آیات میں چند اور بھی نشانیوں کا ذکر ہے - یہاں صرف وہ چھ آیات بیان کی گئی ہیں جو وَمِنْ اٰیٰتِہٖ سے شروع ہوئی ہیں - ان تمام آفاقی وانفسی آیات کا حوالہ دینے کا مفاد یہ ہے کہ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں ان کا مطالعہ کرو کتاب فطرت کو پڑھو - اور اس سے معرفت حاصل کرو - اور اس سے اللہ تعالےٰ کے وجود اور اللہ کی توحید اور اس کی صفات کمال کا علم حاصل کرو - ان سب کا حاصل یہ ہے -

فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ط لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ط ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (آیت ۳۰)

پس (اے نبی اور نبی پر ایمان لانے والو!) یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف جما دو - قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے - اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی - یہی بالکل راست اور درست

دین ہے ۔ لیکن اکثر لوگ اس کا شعور نہیں رکھتے —

دین قیم کہہ لیں، دین حنیف کہہ لیں یہ درحقیقت دین فطرت ہے اس پوری کائنات میں جو نظم ہے، جو ضبط پایا جاتا ہے جس خلاقی اور حسن حکمت کے مظاہر نظر آتے ہیں، ان سب کا تقاضا اور مطالبہ یہی ہے کہ ان کے خالق کی بندگی کی جائے اور یہی دعوت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن حکیم دے رہے ہیں ۔

اس سورۃ مبارکہ میں دو آیات انتہائی حکمت والی وارد ہوتی ہیں ۔ پہلی یہ کہ :

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ○ (آیت ۳۹)

لوگو! تم اپنا جو مال لوگوں کو سود پر دیتے ہو تاکہ وہ ان کے مالوں میں بڑھے اور نشوونما پائے، محنتیں وہ کریں لیکن تمہارا مال بیٹھے بٹھائے اور بلا محنت اور بلا خطر بڑھتا جائے ۔ سود کی یہ ایک انتہائی گھناؤنی تصویر ہے جو اس میں کھینچ دی گئی ہے ۔ انسان کی فتوت اور شرافت اور مروّت کے کس قدر خلاف ہے یہ بات کہ وہ کسی کو سود پر رقم دے اور وہ شخص محنت کر کے اس میں اضافہ کر رہا ہو یہ بغیر محنت کئے ہوئے اس میں سے اپنا حصہ وصول کرے ۔ فرمایا اللہ کے ہاں اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ۔ ہاں اللہ کے ہاں اگر اضافہ چاہتے ہو تو اس ربا اور سود کے بالکل برعکس معاملہ ہے۔ زکوٰۃ و صدقات اور اپنا فاضل مال لوگوں کو ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو تاکہ اللہ تم سے راضی ہو جائے ۔

تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ○

یہ ہیں وہ لوگ جن کے دونے ہو جائیں گے ۔ جن کا مال بڑھتا رہے گا ۔

اللہ کے ہاں ان کے مال کے عوض ان کے اجر میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا - اضعافا مضعفہ ـــــ والا معاملہ ان کے ساتھ ہوگا اور پھر یہ ان کو ملے گا اللہ کے ہاں اس حال میں کہ بہت بڑھا ہوا بھی ہوگا اور اعلیٰ اور بہتر صورت میں بھی ہوگا -

دوسری وہ آیہ مبارکہ جو واقعہ یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے نہیں بلکہ آج کے حالات ہی میں نازل ہوئی ہو- وہ آیت یہ ہے کہ :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۴۱)

"برو بحر میں خشکی اور تری میں فتنہ و فساد رونما ہو گیا ہے لوگوں کی اپنے ہاتھوں کی کمائی سے"۔

آج کے حالات کو اگر ہم پیش نظر رکھیں کہ جس طرح دنیا انتہائی خطرات و خدشات کو محسوس کر رہی ہے کچھ معلوم نہیں کہ کب تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے اور اس کے نتیجے میں کچھ پتہ نہیں کہ شاید یہ زمین ختم ہی ہو کر رہ جائے اور اسکے پرخچے اڑ جائیں - یا یہ کہ اگر یہ باقی بھی رہے تو نوع انسانی کا وجود جو ہے وہ نیست و نابود ہو جائے - یا برائے نام رہ جائے - فرمایا :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

بحر و بر میں یہ فتنہ و فساد لوگوں کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہے -

اور یہ درحقیقت اس لئے ہوتا ہے -

لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا

تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے کرتوتوں کا مزا چکھائے کچھ سزا اس دنیا میں نقد دے دے اور یہ سزا اس لئے ہوتی ہے کہ :

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (آیت ۴۱)

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ان چیزوں سے متنبہ ہو کر اللہ کی طرف رجوع کریں -

لٹد کی جناب میں توبہ کریں - اس سے پھر عہد بندگی از سرنو استوار کریں
آخری بات وہی کہ جو اکثر و بیشتر مکی سورتوں کے آخر میں آئی -

فَاصْبِرْ

اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبر کیجئے، جمے رہئیے ان تمام مخالفتوں
ن ان تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کا صبر و ثبات کے ساتھ مقابلہ کیجئے۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ۔

اللہ کا وعدہ سچا ہے وہ وقت آکر رہے گا کہ اللہ کا دین غالب ہوگا وہ
قت آکر رہے گا کہ فتح و کامرانی آپ کے قدموں کو چومے گی لیکن یہ کہ اس
نت جو صورت حال ہے اس سے ہراساں نہ ہوں -

وَلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ۝ (آیت ۶۰)

دیکھئے کہیں وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے جو اللہ پر اور آخرت پر یقین
ں رکھتے، آپ کو ہلکا نہ پائیں - یا کہیں آپ کو ہلکا نہ سمجھ بیٹھیں - ان
اعراض و تمسخر اور تشدد سے آپ کے صبر و ثبات میں کہیں کوئی لرزش نہ آنے پائے - آپ
ہر کی روش پر جمے رہیئے - یہ ہے وہ ہدایت جس پر اکثر و بیشتر مکی سورتوں
بخصوص ان سورتوں کا جو ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں اختتام ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار
صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نقش قدم کی پیروی
کرنے کی توفیق عطا فرمائے -

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم
ونفعنا واياكم بالآيات والذكر الحكيم

درسِ حدیث

انفاق فی سبیل اللہ

ریاض الصالحین

قال اللہ تعالیٰ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ:

سورۃ البقرہ آیت ۲۶۷۔

اے ایمان والو خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور جو ہم نے نکال دیا تمہارے لئے زمین میں سے۔ اور نیت نہ رکھو گندی چیز پر کہ خرچ کرو۔

وعن انس رضی اللہ عنہ قال: کان ابو طلحۃ رضی اللہ عنہ اکثر الانصار بالمدینۃ مالا من نخل وکان احب اموالہ الیہ بیرحاء وکانت مستقبلۃ المسجد وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدخلھا ویشرب من ماء فیھا طیب۔ قال انس فلما نزلت ھذہ الآیۃ: (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ) جاء ابو طلحۃ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا رسول اللہ ان اللہ تعالیٰ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ مدینہ کے انصار میں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ مال دار تھے کھجور کے درخت میں، اپنے اموال میں سے سب سے زیادہ محبوب بیرحاء (کھجور کا باغ) تھا جو کہ مسجد (نبوی) کے سامنے تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں جایا کرتے تھے اور اس کے میٹھے پانی میں سے پیتے تھے حضرت انسؓ نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی (تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک وہ چیز خرچ نہ کرو جو تم بہت پسند کرتے ہو) تو حضرت ابو طلحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا

انزل علیك لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ	اے رسول اللہ بے شک اللہ نے آپ پر
حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وان	اتاری لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
احب مالی الی بیرحاء	مِمَّا تُحِبُّوْنَ اور مجھے اپنے مال میں سب
وانها صدقة لله تعالی ارجو	سے محبوب بیرحا باغ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ
برها وذخرها عند الله تعالی	کے لئے صدقہ ہے میں اللہ کے ہاں
فضعها یارسول الله حیث اراك	اس کی خیر اور اس کے اجر کی امید رکھتا
الله۔ فقال رسول الله صلی الله	ہوں چنانچہ اے اللہ کے رسولؐ اس کو
علیه وسلم: بخ ذالك مال	وہاں لگا دیں جہاں اللہ آپؐ کی رہنمائی
رابح ذالك مال رابح وقد	کرے۔ چنانچہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
سمعت ما قلت وانی اری	وسلم نے، تحسین ہے یہ مال نفع مند ہے
ان تجعلها فی الاقربین	یہ مال نفع مند ہے اور میں نے سن لیا
فقال ابو طلحة: افعل یا	جو تم نے کہا اور میری رائے یہ ہے کہ تو
رسول الله فقسمها ابو طلحة	اس کو اپنے قریبی رشتہ داروں کو عنایت
فی اقاربه وبنی عمه (متفق علیہ)	کر دے۔ پھر کہا ابو طلحہؓ انصاری نے،

میں ایسا ہی کروں گا یا رسول اللہ۔ چنانچہ ابو طلحہؓ نے اسے اپنے اقربا میں اور اپنے چچا کے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔

ایمان باللہ کا سب سے بڑا تقاضا جہاد ہے۔ جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس ہے اور اس کی آخری منزل اللہ کے دین کو نافذ کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دینا ہے۔ جہاد کے دو حصے ہیں۔ جہاد بالمال یا انفاق اور جہاد بالنفس یا قتال۔ ایمان ایک باطنی کیفیت ہے۔ خارج میں اس کا مظہر جہاد ہے۔ جہاد اگر ہے تو دل میں ایمان بھی ہے اور اگر جہاد نظر نہیں آ رہا تو ایمان بھی موجود نہیں یہ ایک سادہ سی نسبت ہے یعنی جہاد اور ایمان راست متناسب (Directly Proportionate) ہیں۔

یہ حقیقت واضح رہے کہ جب دل میں ایمان کمزور ہو گا تو اس کی جگہ لینے کے لئے نفاق و منافقت آ جائیں گے بالکل ایسے ہی جیسے کسی جگہ ہوا کا دباؤ کم ہو تو دوسری جگہ کی آندھی اس کو پُر کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے پر انتہائی زور دیا گیا اور فرمایا گیا کہ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرو اور یہی ایمان، خلوص، تقویٰ، بر اور سچائی کی اصل نشانی ہے۔ اگر اللہ

کے راستہ میں انفاق نہیں ہے تو ایمان کو کوئی روگ یا دیمک لگ گئی ہے۔ یہ دیمک یا بیماری نفاق اور منافقت کی بیماری ہے۔ چنانچہ انفاق اور نفاق ایک دوسرے کے الٹ متناسب (Inversely Proportional) ہیں۔ اگر اللہ کی راہ میں انفاق ہے تو نفاق نہیں ہے اور اگر انفاق نہیں ہے تو نفاق ہے۔

نفاق جیسی مہلک اور خوفناک بیماری سے بچنے کا تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ اس انفاق کا نقطۂ آغاز زکوٰۃ ہے جو کہ ہر مسلمان پر فرض ہے چاہے اس کے قلبی ایمان کی کیسی بھی کیفیت ہو۔ اور اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی بنیادی ضروریات کے بعد بچ جائے وہ سارے کا سارا اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ زیر مطالعہ درس میں جو اہم بات قابل غور ہے وہ یہ کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کی جائے ایک تو وہ پاکیزہ ہو، حلال ہو، حرام ذرائع سے کمائی نہ گئی ہو۔ حرام ذرائع سے کمائی گئی رقم اللہ کے ہاں قطعاً قابل قبول نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ پیش نظر رہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو وہ اپنے مالوں کا گھٹیا اور ردی حصہ نہ ہو، جس کی طرف قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت میں ذکر کیا گیا۔ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو وہ پاک طیب اور جید ہو، چنانچہ فرمایا گیا کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے یہاں تک کہ تم وہ مال خرچ نہ کرو جو تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اگر گھٹیا مال خرچ کرو گے تو تم ہرگز متقی، برّ، صادق اور سچے نہیں کہلا سکتے۔ اگر اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو مال کی محبت کو دل سے کھرچ دو، مال کی محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کر دو تب تم نیکی کے درجے کو پہنچ جاؤ گے اور اللہ کے ہاں نیک اور صالح شمار کئے جاؤ گے جب تک مال کی محبت دل میں رہے گی اللہ کی محبت دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس معاملہ میں بہترین مثال نبی اکرمؐ کے صحابی حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کی مثال پیش نظر رہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ تو وہ فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ حضورؐ میرا سب سے محبوب باغ اللہ کی راہ میں حاضر ہے۔ آپؐ اسے جہاں چاہیں خرچ کر دیں اور میں اس کے بدلے میں اللہ سے خیر، بھلائی اور بہتر جزا کی امید رکھتا ہوں۔ یہ تھا حضورؐ کے صحابہ کا جذبۂ انفاق، اس لئے کہ ان کے دلوں میں ذرہ برابر نفاق نہیں تھا۔

اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِاَنْ نُّنْفِقَ فِيْ سَبِيْلِكَ مَالًا جَيِّدًا طَيِّبًا آمین

تعارف مہمان مقرر

مولانا سعید اکبر آبادی مدظلہٗ

——— پروفیسر محمد اسلم

سامعین با تمکین !

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس پُر وقار تقریب کے صدر گرامی قدر پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا آپ حضرات سے تعارف کرانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ میرے لیے یہ ایک کٹھن کام ہے۔ صاحبِ صدر گوناگوں خوبیوں کے مالک اور برعظیم پاک و ہند کے نامور عالمِ دین ہیں۔ اس لیے اس مختصر سے مقالے میں ان کا تعارف کما حقہٗ کرانا ممکن نہیں ہے۔

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا آبائی وطن بچھراواں ضلع مراد آباد ہے، جو گجرولہ کے نزدیک رئوسا اور شرفا کی مشہور بستی ہے۔ مولانا کے والد مرحوم و مغفور ڈاکٹر ابرار حسن آگرہ میں پریکٹس کرتے تھے اور انہوں نے اپنے فن میں بڑا نام پایا تھا۔

مولانا اکبر آبادی صاحب آگرہ میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ اسی مناسبت سے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اکبر آبادی لکھنا شروع کیا۔

مولانا اکبر آبادی کی ولادت کا واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر ابرار حسین مرحوم کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ اور اُس کے بعد کئی سال تک اور کوئی بچہ پیدا نہ ہُوا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی اکلوتی بچی کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ ایک بار موصوف طاعون کے کسی مریض کو دیکھ کر اپنے گھر آئے تو بچی فرطِ محبت سے ان کے ساتھ لپٹ گئی اور اُسے Infection ہو گئی۔ دوسرے تیسرے دن اس کی بغل میں طاعون کی علامت نمودار ہوئی اور بچی اپنے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچ گئی۔

اکلوتی بیٹی کی وفات کا ڈاکٹر صاحب پر اتنا اثر ہُوا کہ اُن کا دل دنیا سے اُچاٹ

ہو گیا اور موصوف نے برِ عظیم سے ہجرت کا عزم کر لیا۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ وہ حجاز مقدس چلے جائیں اور وہیں بقیہ زندگی گزاریں۔

ڈاکٹر صاحب ہجرت کی اجازت لینے کے لیے اپنے مرشد حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے دامنِ ارادت سے اُردو کے نامور شاعر اصغر گونڈوی، اور جگر مراد آبادی وابستہ تھے۔ جگر نے شعلۂ طُور میں اپنے مرشد گرامی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎

پابندِ شریعتِ نبیؐ ہوں
خاکِ درِ دولتِ غنی ہوں

حضرت شاہ عبدالغنی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں فرزند سعید عطا فرمائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مرشد کے کہنے پر ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ دو تین سال یونہی گذر گئے۔

ڈاکٹر صاحب دوبارہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے کہا تو تھا کہ اللہ تعالیٰ فرزندِ سعید عطا کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب پُر امید ہو کر واپس لوٹے اور کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی دلی مراد پوری کر دی۔

جس صبح مولانا اکبر آبادی عدم سے وجود میں آئے، اُسی شب ڈاکٹر صاحب نے خواب میں اکابرینِ دیوبند کو دیکھا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی اور فرزندِ سعید کی ولادت پر اظہارِ مسرت فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نومولود کا نام سعید احمد رکھا۔

مولانا بچپن ہی سے بڑے ذہین اور فطین تھے۔ آٹھ نو برس کی عمر میں مشکل سے مشکل شعر کا صحیح مفہوم بیان کر دیتے تھے۔ اُن کے نانا محمد ابراہیم مرحوم نے اپنے داماد ڈاکٹر ابرار حسین کو تاکید کی کہ وہ اپنے فرزند کی تربیت میں کوتاہی نہ کریں۔

مولانا سعید احمد صاحب کی ابتدائی تعلیم آگرہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے السنۂ شرقیہ کے امتحانات پاس کیے اور اس سلسلے میں اِن کا قیام لاہور میں بھی رہا۔ اُس زمانے میں لاہور علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ علاّمہ اقبال، مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا ظفر علی خان، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، اختر شیرانی، محمد دین تاثیر، حفیظ جالندھری، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور ڈاکٹر برکت علی قریشی جیسے فضلاء کے دم قدم سے لاہور کی ادبی محفلیں قائم تھیں۔ شام کے وقت حضوری باغ میں شاعر اور اہلِ علم جمع ہوتے اور دیر تک علمی موضوعات پر گفتگو رہتی۔ مولانا ان محافل میں شریک ہوتے۔

مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ کے درسِ قرآن کا پورے ملک میں شہرہ تھا۔ موصوف امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد رشید تھے اور انہوں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے فلسفہ کی روشنی میں قرآن حکیم کا مطالعہ کیا تھا۔ مولانا اکبر آبادی اُن کے درس میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔

سکول اور کالج کی تعلیم کے بعد ڈاکٹر ابرار حسین صاحب نے ان سے کہا کہ یہ تعلیم تو انہوں نے اپنی مرضی سے حاصل کی ہے لیکن اب اُن کی مرضی سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو جائیں۔

جب مولانا اکبر آبادی دارالعلوم میں داخل ہوئے تو اُس زمانے میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رح کے درسِ حدیث کا شہرہ برِعظیم سے نکل کر مصر و شام تک پہنچ چکا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ شارح مسلم شریف دینی حلقوں سے اپنی علمیت کا سکہ منوا چکے تھے۔ علامہ ابراہیم بلیاوی منطق و فلسفہ میں استادِ کُل مانے جاتے تھے۔ مولانا اعزاز علی دیوبندی عربی ادب پر آخری سند تسلیم کیے جاتے تھے۔

مولانا حسین احمد مدنی اپنے ورع و تقویٰ کے لیے ضرب المثل تھے۔ حضرت میاں اصغر حسین صاحب پیدائشی ولی مانے جاتے تھے۔ اُسی زمانے میں مولانا رسول خان مرحوم، مفتی عزیزالرحمٰن عثمانی مرحوم، مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی بھی دارالعلوم میں مصروفِ تدریس تھے۔

مولانا اکبر آبادی صاحب نے ان تمام حضرات سے استفادہ کیا۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اپنے زمانے کے نامور اساتذہ سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۲۶ء میں انہوں نے فریضۂ حج ادا کیا۔ سفرِ حج میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا محمد سہول بھاگلپوری، مفتی محمد کفایت اللہ — اور

شفیع داؤدی جیسے بزرگ ان کے ہم سفر تھے۔

دیوبند سے فراغت کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ ڈابھیل میں بھی گذارا۔ اُن دنوں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی بھی وہیں تھے۔ مولانا اکبرآبادی بھی عملۂ تدریس میں شامل ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر کے شاہ صاحب کی دعاؤں کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں داخل ہو گئے۔ یہیں سے انہوں نے ایم۔اے کیا اور پھر اسی کالج کے عملۂ تدریس میں شامل ہو گئے۔ اسی کالج میں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

مولانا اکبرآبادی صاحب نے مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں بھی چند سال پڑھایا ہے۔ وہیں عبدالصمد صارم اور مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم نے ان سے پڑھا تھا۔

مولانا اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے مل کر ۱۹۳۸ء میں "ندوۃ المصنفین" کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ اب ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اب تک اسلام کے بارے میں اس ادارے نے صدہا ٹھوس اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔

۱۹۳۸ء میں ہی ندوۃ المصنفین سے ماہنامہ "برہان" نکلنا شروع ہوا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک مولانا اکبرآبادی ہی اس مجلّہ کے مدیر ہیں۔ اگر ان کے صرف اداریے ہی جمع کیے جائیں تو اُن کی ضخامت ہزاروں صفحات تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر ان کی تمام تصانیف اور تحریروں کو ایک جگہ رکھا جائے تو ان کی طوالت اِن کے قد سے بڑھ جائے گی۔

مولانا اکبرآبادی صاحب کی تصانیف میں سے صدّیق اکبر، عثمان ذوالنورین، غلامانِ اسلام، اسلام میں غلامی کی حقیقت، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد، مسلمانوں کا عروج و زوال، وحیٔ الٰہی، فہمِ قرآن، خطباتِ اقبال پر ایک نظر، چار علمی مقالات اور نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت خاص طور پر مشہور ہیں۔ انہیں عربی، انگریزی، فارسی اور اردو پر یکساں عبور حاصل ہے، اور

چاروں زبانوں میں بڑی روانی کے ساتھ تقریر کر لیتے ہیں۔

مولانا اکبر آبادی صاحب ۱۹۴۷ء تک سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں پڑھاتے رہے۔ تقسیم ہند کے وقت اِن کا گھر بھی لُٹا اور موصوف بمشکل تمام اپنی جان بچا کر اہل و عیال سمیت مراد آباد تشریف لے گئے۔ جب ذرا امن جمی ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے اِن سے کہا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کا تمام عملہ اور طلبہ مشرقی پاکستان چلے گئے ہیں۔ آپ کلکتہ جا کر اس مدرسہ کو دوبارہ کھولیں۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا اکبر آبادی صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ پہلے ہندوستانی عالم تھے جو اس منصب پر فائز ہوئے۔ ان سے پہلے تقریباً پونے دو سو سال تک انگریز ہی اس مدرسہ کے پرنسپل رہے تھے۔ اِس ضمن میں سر ڈینی سن راس اور مارگولیتھ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔

مولانا اکبر آبادی ۱۹۵۹ء تک مدرسہ عالیہ کے پرنسپل رہے۔ انہوں نے مدرسے کو، جو بالکل ختم ہو چکا تھا، دوبارہ کھولا اور پورے ملک سے نامور علماء و فضلاء کو بلا کر مدرسے میں درس و تدریس کا فریضہ سونپا۔

۱۹۵۹ء میں موصوف علی گڑھ تشریف لے آئے۔ یہاں انہیں سُنّی دینیات کے شعبہ کا صدر اور فیکلٹی آف تھیالوجی کا ڈین مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد موصوف FULL پروفیسر بنا دیئے گئے۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران میں ہی انہیں کینیڈا کی Mc Gill یونیورسٹی سے آفر ہوئی اور موصوف ایک سال کے لیے کینیڈا تشریف لے گئے۔

۱۹۶۶ء میں میرا اِن سے قریبی تعلق قائم ہوا۔ یوں تو ۱۹۵۵ء سے ہم ایک دوسرے سے آشنا تھے اور ہماری پہلی ملاقات کلکتہ میں ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۶۶ء کے اوائل میں مولانا نے مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیا۔ اس کے بعد میں ہر سال علی گڑھ جانے لگا۔ موسمِ گرما کی تعطیلات ان کے ساتھ گزارتا اور ان سے اور علی گڑھ کے دوسرے فضلاء سے خوب استفادہ کرتا۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد مولانا اکبر آبادی صاحب تغلق آباد دہلی میں ہمدرد کے ایک تحقیقی ادارے سے منسلک ہو گئے اور وہاں اندازاً چار سال تک کام کرتے

رہے ۔ اس دوران میں انہوں نے شیخ الرئیس بوعلی سینا کی القانون کو مرتب کیا۔

ہمدرد سے فارغ ہونے کے بعد موصوف کالی کٹ یونیورسٹی میں Visiting Professor مقرر ہوگئے۔ وہاں ایک سال رہنے کے بعد علی گڑھ واپس آئے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں اپنے ہاں Visiting Professor بنادیا جب یہ مدت پوری ہوئی تو دارالعلوم دیوبند میں ان کے لیے شیخ الہند اکادمی قائم کی گئی۔ موصوف اس اکادمی کے ڈائریکٹر ہیں۔ دیوبند میں قیام کے دوران میں مولانا اکبرآبادی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے ہیں جس میں اساتذہ اور منتہی طلبا شریک ہوتے ہیں۔

دراصل دیوبند میں ان کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مہتمم صاحب کے ساتھ ایک جیّد عالم بھی ہر وقت موجود رہیں، جن سے مہتمم صاحب اہم امور میں مشورہ لیتے رہیں۔

مولانا اکبرآبادی صاحب کا شمار بھارت کے چند گنے چُنے علما میں ہوتا ہے۔ موصوف کئی بار غیر ممالک میں مختلف علمی کانفرنسوں میں بھارت کی نمائندگی کرچکے ہیں۔ موصوف جنوبی افریقہ کے دینی حلقوں میں بھی جانے پہچانے بزرگ ہیں۔ اور متعدد بار جنوبی افریقہ کا دورہ کرچکے ہیں۔

مولانا اکبرآبادی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جتنی اُن کی نظر وسیع ہے، اُتنا ہی اُن کا دل بھی وسیع ہے۔ موصوف ہاتھ کے سخی اور دل کے غنی ہیں، کیوں نہ ہو، آخر کو شاہ عبدالغنی کی دُعا سے پیدا ہُوئے ہیں۔

اِن دنوں مولانا اکبرآبادی صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیات وسیرت لکھنے کا سلسلہ شروع کرچکے ہیں۔ اس سے قبل صدیق اکبرؓ اور عثمان ذوالنورینؓ پر تحقیقی کام کرچکے ہیں۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ، یہ سعادت اِن ہی کے حصّے میں آئی ہے کہ خلفائے راشدین کی حیات وسیرت پر شاہکار کتابیں تحریر فرمائیں۔ میں اِن کتابوں کو اِن کے لیے زادِ آخرت سمجھتا ہوں۔

مولانا اکبرآبادی صاحب دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین ہیں اور دارالعلوم کی ترقی وتوسیع کے لیے کوشاں ہیں۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ انہیں عمرِ خضر کے ساتھ دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع عطا فرمائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

سیرت و شخصیّت

علمی و عملی کارنامے ——— اور

حضرت شیخ الہند کا ان سے خصوصی تعلق خاطر

——— (مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ کا ایک خطاب) ———

معزز حضرات! محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! علمائے کرام! بزرگو اور دوستو! مولانا ابو الکلام آزاد ہماری ملت کے کاروان رفتہ کے ان پاسبانوں اور نگہبانوں میں سے تھے جن کا جب ذکر آتا ہے اور جب ان پر تقریر کرنے کے لیے کوئی مرحلہ سامنے آتا ہے تو عزیز لکھنوی کا وہ شعر بیساختہ یاد آجاتا ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اس لیے کہ ان کے ساتھ جو پرانی یادیں وابستہ ہیں اور جو پرانے واقعات ان سے متعلق ہیں، ان کا نام زبان پر آتے ہی وہ سب دل و دماغ میں اجاگر ہو جاتے ہیں اور ایک حسرت پیدا کرتے ساتھ ہی عہد گزشتہ میں لے جاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم عبقری یا GENIUS کہتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی ذہانت و فطانت اور بلند درجہ کی قوتِ فہم و ادراک کے حامل تھے۔ میرا بچپن تھا جب مولانا کی شخصیت اور شہرت کا آفتاب نصف النہار پہ تھا۔ میں دیوبند میں پڑھتا تھا اور مولانا کے تذکرے اور چرچے سنتا تھا۔ گو مجھے دیوبند کے قیام کے عرصہ میں ان جلسوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جن میں مولانا کی بڑی

شاندار تقریریں ہوئی تھیں۔ اس لیے کہ میں طالب علمی کے زمانے میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا تھا اور باہر کی دلچسپیوں سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ میرا سب سے پہلا اتفاق مولانا سے ملاقات کا ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے آخر وقت تک جبکہ مولانا اس دنیا سے رخصت ہوئے، مجھے ان کی خدمت میں بیٹھنے، ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت کے مطالعہ کا بھی موقع ملا۔ اس بنا پر میں اس وقت آپ کے سامنے جو کچھ بھی عرض کروں گا، اس کے دو حصے ہوں گے۔ پہلا وہ جس کو میں نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں سے سنا ہے اور دوسرا حصہ ان واقعات پر مشتمل ہوگا جن کا میں نے خود ذاتی طور پر مشاہدہ کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو پیری مریدی کا گھرانا کہلاتا ہے جہاں بیعت کا رواج اور تصوف کا بڑا چرچا تھا اور مولانا آزاد کے والد بزرگوار کے عقیدت مندوں اور مریدوں کا ایک بڑا وسیع حلقہ تھا۔ لیکن مولانا آزاد کی طبیعت میں ان طور طریقوں سے بغاوت کے رجحانات شروع ہی سے تھے۔ انہوں نے اس طریقہ کو پسند نہیں کیا۔ ان کی تعلیم کہاں پر ہوئی اور کس طرح انہوں نے مختلف علوم پڑھے اس کی بھی کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن مولانا نے اس کے متعلق خود جو آخری بات اپنی کتاب 'INDIA WINS FREEDOM' میں اپنے ذاتی حالات کے سلسلہ میں لکھی ہے۔ وہی میرے خیال میں زیادہ مستند سمجھی جانی چاہیے مولانا کی تعلیم کسی مستند اور باقاعدہ مدرسہ میں نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے والد ماجد بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کے حلقہ ارادت میں بڑے بڑے علماء داخل تھے جو صاحبان فن تھے اور خاص خاص فنون میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے والد ماجد نے مولانا کو بچپن ہی میں بغرض تعلیم مختلف علوم و فنون کے ماہر علماء کے سپرد کر دیا۔ مولانا نے علوم دینیہ و اسلامیہ اور فنون عربیہ کی تحصیل تو کی ہی تھی۔ لیکن دوسرے علوم و فنون میں ان کی وسعت نظر کا کیا حال تھا! اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ارباب علم اس بات کو جانتے ہیں کہ ابوریحان البیرونی کی ایک مشہور کتاب "قانون مسعودی" کے نام سے ہے یہ کتاب دقیق ریاضی یعنی HIGHER MATHAMATICS کی کتاب ہے جو لوگ ریاضیات میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ وہی اس کتاب کو پڑھ اور سمجھ سکتے

ہیں۔ عام تعلیم یافتہ حضرات کی سمجھ میں اس کی بات آتی ہی نہیں ـــــ میں نے متعدد لوگوں سے سنا تھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے کتاب خانہ میں جس زمانے میں مدرسہ کے پرنسپل سر ڈینی سن راس تھے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک ایک نادر نسخہ 'قانون مسعودی' کا موجود تھا۔ نادر اس لیے کہ اس وقت تک اور شاید تاحال اس کے سوا کسی اور نسخہ کا پتہ نہیں چلا۔ مدرسہ عالیہ کی لائبریری اپنے بعض نوادرات کے اعتبار سے خاص خصوصیت رکھتی تھی۔ بتایا جاتا ہے۔ کہ ایک روز سر ڈینی سن راس جو لائبریری کے انچارج بھی تھے اور جنہوں نے یہ قانون بنا رکھا تھا کہ کوئی شخص بھی جو سولہ سال سے کم عمر کا ہو اس لائبریری سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ ایک روز چپڑاسی نے آکر اطلاع دی کہ ایک تیرہ چودہ سال کا خوبصورت سا لڑکا کہتا ہے کہ میں لائبریری میں قانون مسعودی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ Sir Ross کو بڑا تعجب ہوا، اس نے اس لڑکے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد۔ ان سے سر راس نے کہا میاں صاحبزادے! آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں! انہوں نے جواب دیا قانون مسعودی۔ سر راس نے پوچھا کیا آپ اسے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں! مولانا نے کہا کہ جناب والا آپ کتاب منگا لیجئے اور کوئی صفحہ مجھے بتائیے اگر میں اس کو پڑھ کر آپ کو سنا دوں اور اس کا مطلب بیان کر دوں، تو مجھے اس کے مطالعہ کی اجازت ملنی چاہیئے۔ چنانچہ سر راس نے یہی کیا انہوں نے اپنی کوٹھی میں جہاں مولانا سے یہ گفتگو ہوئی اور جس میں، میں اپنی پرنسپلی کے زمانہ میں خود بھی رہا ہوں، کتاب کا نسخہ منگایا اور ایک مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ صاحبزادے یہاں سے اسے پڑھو۔ مولانا نے تھوڑی دیر اس کا مطالعہ کیا اس کے بعد اسے سنایا اور اس کا مطلب بیان کر دیا۔ سر ڈینیسن کو بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے اس لڑکے کو مستقل طور پر لائبریری کی کتب سے استفادہ کی اجازت دے دی۔ یہ واقعہ میں نے سن رکھا تھا لیکن مجھے اس کی صحت پر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد جب میں مدرسہ عالیہ میں پرنسپل تھا تو میرے زمانہ میں نیشنل پبلک لائبریری کی جو کلکتہ کی بڑی مشہور لائبریری ہے اس کی ایک نئی بلڈنگ بنی جس کے افتتاح کے لیے مولانا آزاد وزیر تعلیم حکومت بھارت کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ مولانا نے تقریر تو اردو میں کی لیکن ان کا خطبہ انگریزی میں چھپا ہوا تھا اور اس میں اس واقعہ کا مفصل ذکر تھا۔ جس کے بعد اس نسخہ کی تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ لندن کی لائبریری کو منتقل ہو گیا۔ جب مولانا

کے علم میں یہ بات آئی تو ان کی کوشش سے وہ نسخہ وہاں سے واپس حاصل کیا گیا پھر دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام اس کی اشاعت ہوئی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا اس پر مقدمہ موجود ہے۔

یہی ایک واقعہ بتاتا ہے کہ مولانا کے اندر عبقریت کتنی اعلیٰ معیار کی تھی۔ وہ اپنی ذہانت وفطانت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں کے اندر بہت ہی ممتاز تھے۔ مولانا آزاد کا اپنے علم وفضل کے لحاظ سے کیا مقام تھا: اس سلسلہ میں دو واقعات آپ کو سناتا ہوں۔ ایک واقعہ تو یہ ہے جو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ جس زمانہ میں، میں مدرسہ عالیہ کا پرنسپل تھا اس زمانہ میں مولانا عبدالحلیم صدیقی جو ایک مشہور عالم اور جمعیت العلما ہند کے ایک مشہور ورکر تھے وہ مدرسہ عالیہ میں محدث تھے۔ جب ان کا تین سال کا کنٹریکٹ ختم ہوگیا تو میں نے ولیسٹ بنگال گورنمنٹ کے متعلقہ محکمہ کو لکھا کہ ان کے کنٹریکٹ کی تجدید نہ کی جائے۔ بلکہ ان کو سبکدوش کر دیا جائے تاکہ ان کی جگہ کسی دوسرے توانا اور جواں عالم کا تقرر کیا جاسکے میرا ارادہ تھا کہ میں ان کی جگہ کسی اونچے درجہ کے محدث کو لاؤں گا۔ میری نظر میں اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی تھے۔ ان ہی دنوں میں مجھے دہلی آنے کا اتفاق ہوا مولانا کو علم ہوا تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ پارلیمنٹ کے اجلاس ہو رہے تھے۔ وہیں آنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ میں پارلیمنٹ میں ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مولانا نے مجھے نو بجے صبح کا وقت دیا تھا۔ اور ٹھیک نو بجے مولانا اپنے کمرے میں تشریف لے آئے۔ مولانا نے پہلے تو میری مزاج پرسی کی۔ مولانا روزے سے تھے۔ موسم بھی گرم تھا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا نے کہا۔ "میرے بھائی"۔ مولانا کے خطاب کا عموماً انداز یہی ہوتا تھا۔ میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مولوی عبدالحلیم صدیقی کے کنٹریکٹ کی تجدید کے حق میں نہیں ہیں۔ میں اس کی وجہ آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ وہ شیخ الحدیث کی جگہ ہے مولانا اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ وہ اس معیار کی اب تعلیم نہیں دے سکتے جس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں ان کی جگہ ایک دوسرے محدث کو لانا چاہتا ہوں۔ مولانا ادیب ہیں، بہت لائق اور عالم ہیں لیکن فن حدیث میں جس طور پر پڑھانا چاہیئے اس طرح تعلیم اب ان کے بس میں نہیں ہے۔ بس میرا یہ کہنا تھا۔ کہ مولانا آزاد میرے سر ہو گئے اور فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کہا کہ فن حدیث جس طرح

پڑھایا جانا چاہیے اس طرح مولانا عبدالحلیم نہیں پڑھا سکتے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق عرض کیا کہ فن حدیث کو پڑھانے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پڑھانے والا اسمائے رجال سے خوب واقف ہو۔ طرق اور اسانید پر بھی اس کی گہری نظر ہو۔ درایت اور روایت کے جو اصول ہیں، ان پر بھی اس کی نظر ہو۔ جرح و تعدیل سے بھی وہ بخوبی واقف ہو۔ آپ یقین کیجئے کہ اس پر مولانا نے ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل تقریر کی اور مجھے بتایا کہ فن حدیث دراصل کیا ہے۔ اس کے کتنے اہم شعبے ہیں۔ کتنی شاخیں ہیں۔ ہر شعبہ اور شاخ کی کیا خصوصیات ہیں۔ ان پر اب تک کون کون سی معتبر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فن حدیث کس دور میں اور کس انداز سے ہندوستان میں آیا اور کہاں کہاں اس کی بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ اور فن حدیث کو پڑھانے کی خصوصیات کیا رہیں؟ کون کون سے محدثین اب تک ہندوستان میں ایسے گزرے ہیں جو اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔ ہوتے ہوتے وہ اس دور تک آگئے اور فرمانے لگے کہ آج کل پورے ہندوستان میں فن حدیث کی تعلیم و تدریس اس طور پر نہیں ہو رہی جس طور پر فن حدیث کو پڑھانا چاہیئے۔ اس دور میں مولانا عبدالحلیم صدیقی اور ان جیسے گنتی کے محدث ہوں گے جو کچھ نہ کچھ اس فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنے والے علماء تو معیار کے لحاظ سے ان سے بھی گئے گزرے ہوں گے۔ آپ تجربہ کرنا چاہیں تو کرلیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تجربہ صحیح نہیں ہوگا۔ آخر میں فرمایا میرے بھائی! اب انور شاہ تو آپ کو ملیں گے نہیں۔ وہ فن حدیث کے اساتذہ میں آخری آدمی تھے۔ جو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب تو مولانا عبدالحلیم صدیقی ہی کو غنیمت سمجھئے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا، میرے بھائی! میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ آپ کو یاد رہے گا۔ میں نے ازراہِ شوخی کہا۔ "میں یاد نہ رکھوں گا تو کیا اپنے آپ سے دشمنی کروں گا"۔ میری اس بات کو مولانا نے نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا "میرے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے"۔ اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا اور تقریباً گیارہ بجے دروازے تک آکر مجھے رخصت کیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ پارلیمنٹ جاری ہے۔ اس میں بیٹھے ہیں۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی مصروفیات بھی بے پناہ ہو گئی تھیں مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ اس دور میں بھی وہ سختی کے ساتھ اپنے دیرینہ معمولات پر کاربند تھے۔ عموماً وہ رات کو نو بجے سو جاتے تھے پھر ڈھائی بجے بیدار ہوتے تھے اور اس وقت وہ اپنا لکھنے پڑھنے

کا کام کرتے تھے۔ فجر کی نماز پڑھ کر سو جاتے تھے پھر تقریباً ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر نو بجے دفتر پہنچ جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مصروفیات کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا پھر عمر بھی ضعیفی کی طرف مائل تھی لیکن ان سب کے باوجود استحضارِ علم کا یہ عالم اور یہ حال کہ فن حدیث پر تقریباً مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک انتہائی عالمانہ انداز میں تقریر کی جبکہ سامع صرف اکیلا میں تھا۔

دوسرا یہ واقعہ میرے مشاہدے میں آیا کہ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی یہ دونوں مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت زیادہ قریب تھے۔ مگر دونوں جس عقیدے اور خیال کے تھے، ان میں سے جوش کو تو آپ سب ہی اچھی طرح جانتے ہیں اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اس زمانہ میں جوش سے اس معاملہ میں کچھ کم نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے ایک دن ان دونوں سے کہا کہ میرا آپ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ آپ میرے پاس آتے جاتے ہیں لیکن میں نے اپنا ایک فرض اب تک ادا نہیں کیا جس کا مجھے بہت افسوس ہے اور میں اس کا سچے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کے سامنے اپنا وہ فرض ادا کر دوں۔ دونوں حضرات نے کہا! وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ کے وجود اور مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقانیت پر آپ دونوں کے سامنے میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں جو میری طرف سے تبلیغ حق کی ایک کوشش ہوگی۔ آپ حضرات کو حق ہوگا کہ پوری آزادی کے ساتھ میری باتوں پر تنقید کریں، مجھ سے سوالات کریں، مجھ پر جرح کریں، میں پوری خندہ پیشانی سے انہیں سنوں گا اور امکان بھر آپ کے اشکالات کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ دونوں حضرات نے رضامندی کا اظہار کیا اور کسی آنے والے دن میں صبح نو بجے کا وقت طے ہو گیا۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے مدرسہ فتح پوری میں آکر اپنے حلقہ احباب میں اس کا ذکر کیا تو مولانا محمد میاں مرحوم جو مولانا حامد میاں مدظلہ کے والد ماجد ہیں جو آپ کے اسی شہر لاہور میں جامعہ مدنیہ کے مہتمم اور رئیس ہیں اور مولوی قاضی سجاد حسین صاحب جو مدرسہ اسلامیہ فتح پوری دہلی میں اس وقت مدرس تھے اب پرنسپل ہیں۔ ان دونوں کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ کیا ہم کو بھی اس مجلس میں شرکت کی اجازت ہوگی! چنانچہ فوراً مولانا آزاد سے ان کے سیکرٹری کے ذریعہ رابطہ قائم کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ بڑے شوق سے آپ حضرات بھی تشریف لائیے اور کوئی

بھی آنا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے ـــ چنانچہ مولانا محمد میاں مرحوم اور قاضی سجاد حسین صاحب کا یہ بیان ہے کہ ہم بھی پہنچ گئے۔ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی وہاں موجود تھے۔ ہم چاروں کے سامنے مولانا آزاد نے تقریر کی۔ مولانا محمد میاں کا یہ بیان ہے کہ مسلسل دو گھنٹے تک انہوں نے تقریر کی۔ اور تقریر کا کمال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر سارے دلائل وہ تھے جو قرآن مجید میں ہیں لیکن کہیں قرآن کا حوالہ نہیں دیا کہیں کوئی آیت نہیں پڑھی۔ ان ہی دلائل کو عقلی طور پر اس طرح بیان کیا گویا ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ تمام قرآنی ہی دلائل تھے ـــ تو اس طرح پر وجود باری تعالیٰ، اس کی توحید، مذہب کی ضرورت اور مذاہب میں بھی اسلام کی حقانیت پر مسلسل دو گھنٹے تقریر کی۔ اس کے بعد مولوی عبدالرزاق صاحب نے کہا! مولانا! مجھے تو اب اطمینان ہو گیا۔ میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ لیکن جوش ملیح آبادی نے کہا۔ مولانا! میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا۔ لیکن دل میرا نہیں مانتا، تو مولانا نے کہا کہ میرے بھائی! 'دل پر تو میرا کوئی قابو اور اختیار نہیں ہے'۔ جوش نے کہا کہ مولانا! آپ نے Personal God اور Impersonal God کی جو بحث کی ہے تو میں God کو Impersonal تو ماننے کے لیے تیار ہوں Personal نہیں مان سکتا۔ Impersonal کے معنی وہ ہیں جس کو آج کل Energy کہا جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا نہیں وہ God نہیں ہے۔ جو Impersonal ہے، وہ God ہو ہی نہیں سکتا۔ مولانا نے پھر ثابت کیا کہ God وہی ہے جو Personal ہے۔ اس کی ایک ذات اور ہستی ہے پھر اس کو مزید قوی دلائل سے ثابت کیا ـــ پس یہ دو واقعات ایسے ہیں، جن سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کا علم کتنا مستحضر تھا اور ان کی نگاہ کتنی وسیع تھی۔

مولانا کی شہرت کا آغاز دو چیزوں سے ہوا۔ سب سے پہلے اور سب سے بڑی شہرت کا ذریعہ تو "الہلال" اور "البلاغ" ہوئے۔ اس کے بعد مولانا کی تقاریر ہوئیں۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے فنِ خطابت کا وہ کمال عطا فرمایا تھا جو نہایت شاذ و نادر ہی کسی کو عنایت ہوتا ہے۔ تقریر سے زیادہ ان کی تحریر نے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ تقریر میں بھی فن اور اندازِ خطابت ایسا رچا بسا ہوا ہوتا تھا کہ تیر کی طرح دل میں پیوست ہوتا تھا۔ اس کی ایک

مؤثر ترین وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا نے الہلال اور البلاغ میں اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کو ایک نئی راہ دکھائی جس نے دلوں میں ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کیا۔ عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کا جو حال ہوا سو ہوا لیکن سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ علمائے کرام اور خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کے علمائے عظام کا طبقہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور دیوبند کے حلقہ میں سے بھی بالخصوص شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔ وہ اس لیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جس چیز کا پیام دیتے تھے اور جو درحقیقت ان کی دعوت کا اصل محور و مرکز تھا وہ سب کچھ وہ تھا جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دل کی آواز تھی اور ان کے اپنے دل کی لگن اور تڑپ تھی۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ مولانا آزاد کی دعوت میں اپنے دل کی تمنا، آرزو و خواہش اور امنگ کا عکس دیکھتے تھے۔ اس لیے مولانا آزاد کے سب سے زیادہ قدردان علماء کرام کے حلقہ میں حضرت شیخ الہند تھے۔ حضرت بڑی پابندی سے الہلال اور البلاغ منگایا کرتے اور بڑے ذوق و شوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے۔

جب کانپور میں ایک مسجد حکومت انگلشیہ کے ہاتھوں شہید کی گئی، جس کے ردِ عمل میں حکومت کے خلاف ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں میں غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھا تو حکومت نے آنسو پونچھنے اور اس ہیجان کی شدت کم کرنے کے لیے اس وقت جو یوپی کا گورنر تھا اسے دارالعلوم دیوبند بھیجا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس حادثہ پر نہایت سخت مضامین لکھ چکے تھے۔ جن کو اس جوش و خروش میں بڑا دخل تھا جو مسجد کانپور کو شہید کرنے کے باعث مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ تو وہ بھی دیوبند پہنچ گئے۔ جب مولانا آزاد اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کے دروازے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا گورنر یوپی اندر پہنچ چکے ہیں، وہاں باقاعدہ جلسہ ہو رہا ہے جس میں دیوبند کے تقریباً تمام ہی علمائے کرام موجود ہیں مولانا آزاد نے چاہا کہ وہ اندر جائیں اور جلسہ میں پہنچ کر گورنمنٹ کے اس اقدام پر اپنا احتجاج پیش کریں۔ لیکن وہاں ان کو دروازے پر ہی منتظمین کی ہدایت پر روک دیا گیا اور ان کو بتایا کہ لارڈ صاحب کا حکم ہے کہ آپ کو اندر نہیں آنے دیا جائے لہذا آپ اندر نہیں جا سکتے۔ مولانا آزاد کیا کرتے، دنگا فساد تو ان کے پیش نظر تھا نہیں۔ مجبور ہو گئے۔ اس وقت مولانا کو معلوم ہوا کہ دیوبند کے سارے اساتذہ تو اندر جلسہ گاہ میں موجود ہیں۔ لیکن صرف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں

جو منتظمین کے اس عمل سے سخت ناراض ہیں اور اپنے گھر پر ہی مقیم ہیں۔ ادھر حضرت شیخ الہند کو جب معلوم ہوا کہ مولانا آزاد آئے ہیں اور ان کو دارالعلوم کے دروازے پر روک دیا گیا ہے تو حضرت نے فوراً مولانا آزاد کو اپنے پاس بلوالیا۔ دو تین دن مولانا دیوبند میں حضرت شیخ الہند ہی کے ہاں مقیم رہے۔ حضرت شیخ الہند کا مولانا آزاد سے تعلق خاطر کا یہ واقعہ بھی شاہد ہے۔

حضرت شیخ الہند سے بعض ساتھی علماء نے پوچھا "حضرت آپ البلال اور البلاغ کا اتنا گہرا مطالعہ کرتے ہیں حالانکہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں" حضرت شیخ الہند نے جو جواب دیا وہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ حضرت شیخ الہند کس نظر سے مولانا آزاد کو دیکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے پہلے تو یہ شعر پڑھا ؎

کامل اس طبقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

پھر فرمایا کہ میاں تم اس بات کو دیکھتے ہو کہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں تم یہ بات نہیں دیکھتے کہ وہ فریضۂ جہاد جس سے ہم سب لوگ غافل تھے اس کو سب سے پہلے جس شخص نے یاد دلایا ہے وہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں لہٰذا ہم ان کے نہایت شکر گزار ہیں اس لیے میں ان کے پرچوں کو بڑے اشتیاق سے پڑھتا ہوں۔ پھر یہ کہ اس کے بعد میں حضرت شیخ الہند نے جو تحریک شروع کی تھی، تحریک آزادی، (تحریک ریشمی رومال) اس کا حال آپ حضرت کو معلوم ہوگا تو وہ تحریک ایسی تھی کہ اس میں زیر زمین یعنی Under Ground کام ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت کے دور میں تو یہ باتیں منظر عام پر آ نہیں سکتی تھیں لیکن اب اس تحریک کے متعلق تمام حالات شائع ہو گئے ہیں جن سے یہ بات صاف معلوم ہو گئی کہ حضرت شیخ الہند نے انڈر گراؤنڈ کام شروع کر دیا تھا جہاں باقاعدہ اسلحہ سازی بھی ہوتی تھی اور باقاعدہ ہتھیار چلانے کی ٹریننگ بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ جو لوگ حضرت کے ہم خیال تھے اور ان کے مشن سے تعاون کرتے تھے۔ حضرت نے ان سب سے عہد و پیمان لیا اور وہ سب شیخ الہند کی ہدایت پر خفیہ طور پر اس دعوت اور مشن کے لیے کام کرتے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت شیخ الہند کے سب سے بڑے معاون تھے۔ دوسرے مولانا محمد میاں جو حضرت شیخ الہند کی ہدایت پر کابل چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے حامد الانصاری غازی ہیں۔ تیسرے مولانا سیف اللہ مرحوم تھے، وہ بھی کابل ہجرت کر گئے

تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ افغانستان کی حکومت کے تعاون سے ادھر سے انگریز کے خلاف مسلح اقدام کیا جائے۔ یہ تین بزرگ وہ تھے جو حضرت شیخ الہند کے خاص الخاص اور معتمد علیہ لوگ تھے۔ ان ہی قریب ترین حضرات میں چوتھے نمبر پر مولانا ابوالکلام آزاد کا نام شامل تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اس واقعہ کے بعد جس کا میں کانپور کی مسجد شہید کرنے کے سلسلہ میں ذکر کر چکا ہوں، مولانا دوبارہ بھی کبھی دیوبند تشریف لائے یا نہیں، لیکن اتنا یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مولانا آزاد سے حضرت شیخ الہند کا رابطہ مسلسل قائم رہا خط و کتابت کے ذریعہ سے یا زبانی لوگوں کی وساطت سے۔ حضرت کی اس تحریک کے ایک اہم رکن مولانا آزاد بھی تھے ان تمام شواہد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا شیخ الہند سے بڑا قریبی رابطہ و تعلق قائم تھا۔

مولانا آزاد نے جیسا کہ آپ نے سنا الہلال اور البلاغ کے ذریعہ ایک دعوت دی اس دعوت کو حضرت شیخ الہند دعوتِ جہاد فرمایا کرتے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف دعوتِ جہاد ہی نہیں تھی بلکہ دعوتِ انقلاب تھی۔ مسلمان اپنے جس فرض کو بھول گئے تھے، اس فرض کو مولانا نے یاد دلایا اور اس کے لیے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پر نہایت زور دیا چونکہ مسلمانوں کے پاس اصل قوتِ تسخیر قرآن ہی ہے۔ مولانا نے اس کام کو منظم طور پر کرنے کے لیے ایک جماعت بنائی۔ مولانا نے جو تنظیم بنائی اس کا نام حزب اللہ تھا۔ اس حزب اللہ کے لیے مولانا نے بیعت لی یا نہیں لی، اس کے متعلق میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مولانا نے جو حزب اللہ بنائی تھی، اس کے لیے مولانا کے پیش نظر یہ ضرور ہوگا کہ وہ اس میں شمولیت کے لیے بیعت لیں۔ بہرحال یہ مولانا کا مشن تھا اس کے لیے انہوں نے کام شروع کیا تھا اور اس راہ میں پیش رفت بھی کی تھی۔ اتنا مجھے معلوم ہے۔

عوام الناس میں ان کی شہرت کی بنیاد اور اساس ان کی قرآن اور جہاد کی دعوت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر جگہ انتہائی مقبول ہوئے۔ آپ کے پنجاب میں مولانا بے حد مقبول تھے۔ اس دور کے بڑے بڑے علماء اور دانشور مولانا آزاد کی تحریر، ان کی تقریر اور ان کی دعوت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے پیغام نے سوئی ہوئی روحوں کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ ان کو ایک ولولۂ تازہ سے سرشار کر دیا اور مولانا پورے برصغیر خاص

طور پر پنجاب کے لوگوں کی آنکھوں کا تارا اور ان کے محبوب رہنما بن گئے۔

اس کے بعد جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو مولانا نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس مسئلہ پر مولانا کی ملک کے مشہور شہروں میں سے اکثر میں نہایت زور دار اور ولولہ انگیز تقریریں ہوئیں۔ جو صرف خطابت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ علمی اعتبار سے بھی معرکہ کی تقاریر تھیں۔ آگرہ یعنی اکبر آباد میں خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ایک عظیم جلسہ عام میں مولانا نے 'منصب خلافت' کے موضوع پر نہایت خطیبانہ اور عالمانہ تقریر کی۔ میں خود تو اس جلسہ میں نہیں تھا لیکن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نیز دوسرے لوگوں سے جو اس جلسہ میں موجود تھے، میں نے سنا کہ 'منصب خلافت' جو اب کتابی شکل میں طبع شدہ موجود ہے۔ یہ پورا کا پورا خطبہ مولانا آزاد نے زبانی دیا تھا۔ اس میں بہ کثرت حوالہ جات تھے جو بالکل صحیح تھے۔ جس سے مولانا آزاد کی ذہانت اور ان کے حافظہ کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں بعد میں بھی مولانا نے کوئی اضافہ اور ترمیم نہیں کی۔ بلکہ یہ کتاب جوں کی توں مولانا کی زبانی تقریر پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد نے اس نوع کی جگہ جگہ تقریریں کیں، اور لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ مولانا کا دماغ تو پورا ایک کتب خانہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ شاید ہی مولانا کی کوئی تقریر ایسی ہوتی ہو جس میں مولانا سلف کی کسی نہ کسی معروف علمی شخصیت کی تحریروں کا باقاعدہ حوالہ نہ دیتے ہوں، یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مولانا کا حافظہ اور ان کا مطالعہ کس قدر مضبوط اور وسیع تھا۔

مولانا آزاد کی علمیت کا ذکر زبان پر آیا تو مجھے یہ بات یاد آئی کہ کچھ لوگ کہا کرتے تھے۔ اور شاید اب بھی ایسا کہنے اور سمجھنے والے کچھ لوگ موجود ہوں کہ مولانا آزاد ذہین بہت زیادہ ہیں لیکن ان کا علم بہت کم ہے۔ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مولانا کے انتقال کے بعد ایسی ٹھوس شہادتیں مل گئی ہیں جن سے لوگوں کا یہ قول غلط ثابت ہو جاتا ہے ہمارے یہاں نئی دہلی میں حکومت کا قائم کردہ ایک محکمہ ہے۔ جس کا نام انڈین کلچرل اینڈ سائنس ریسرچ انسٹیٹیوٹ یا اسی سے ملتا جلتا نام ہے اس کی ایک بہت بڑی لائبریری ہے اس میں مولانا آزاد کا ذاتی کتب خانہ منتقل ہو گیا ہے جو بے شمار قیمتی کتابوں پر مشتمل تھا اور اس میں بعض نادر کتب کے نسخے بھی شامل تھے۔ اس لائبریری میں جب مولانا آزاد کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ بہت کم کتابیں مولانا آزاد کے

کتب خانہ کی ایسی تھیں جن پر مولانا کے نوٹ اور حواشی نہ ہوں۔ اس کے برعکس ان کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن پر مولانا نے نوٹ اور حواشی تحریر کیے تھے۔ چنانچہ حکومت نے ایک شخص کو اس کام کے لیے مقرر کیا کہ وہ مولانا کے جن کتابوں پر حواشی ہیں ان سب کو مرتب کر کے پیش کرے۔ چنانچہ تمام حواشی مرتب ہو کر پیش ہوئے اور رسالہ جامعہ دہلی میں وہ قسط وار چھپ گئے ہیں۔ ان حواشی سے مولانا کی دقتِ نظر اور گہرے غور و فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ الغرض مولانا آزاد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ساتھ ہی انتہائی ذہین و فطین تھے۔

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی میں اغلباً ۱۹۲۶ء سے یہ موڑ آیا کہ مولانا نے جمعیت علماء ہند کے کاموں سے وہ عملی دلچسپی لینی چھوڑ دی جو وہ پہلے مسلسل لیتے رہے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور سے مولانا کی تقریباً تمام تر عملی دلچسپیاں کانگریس کے لیے وقف ہو گئی تھیں۔ جمعیت علماء ہند کے سالانہ جلسوں میں وہ اکثر تشریف لاتے تھے تقریر بھی کرتے تھے۔ یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن یہ میرے ذاتی مشاہدہ کی بات ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ جمعیت کی ورکنگ کمیٹی کے تقریباً ہر دور میں ممبر رہے اور وہ اس کے اجلاسوں میں تشریف بھی لاتے تھے۔ لیکن جمعیت کے ساتھ ان کی پہلے جو عملی وابستگی تھی، اور اس کے کاموں میں جو سرگرمی تھی، وہ تقریباً ختم ہو چکی تھی اور ان کی عملی سرگرمیوں کا میدان کانگریس تھی۔ اب ایسا کیوں ہوا؟ مجھے اس کی تحقیق کا موقع نہیں ملا۔ لیکن میں اس معاملہ میں بطورِ قیاس یہ سمجھتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ مولانا آزاد کو یہ محسوس ہوا ہو کہ ہماری رجوع الی القرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت ناکام ہو گئی ہے یا یہ کہ دعوت نے اتنی تیز رفتاری سے لوگوں کے اذہان و قلوب کو مسخر نہیں کیا کہ وہ اس کے لیے اس ایثار و قربانی کے لیے آگے آسکیں جو اس دعوت کے لیے ضروری ہے۔ پھر ترکی میں خلافت کا ادارہ خود مصطفےٰ کمال نے ختم کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں کے جوشِ عمل پر مایوسی اور سرد مہری طاری ہو گئی۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اب تحریک کو دوبارہ زندہ اور متحرک و فعال بننے کا امکان تو نظر آتا نہیں۔ اس لیے اب سب سے پہلے انگریز کی حکومت کا ہندوستان سے خاتمہ کی طرف زیادہ توجہ ہونی چاہیئے چونکہ نہ صرف ہمارے ہی راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے بلکہ پورے

عالم اسلام کو اسی انگریزی حکومت کے ہاتھوں سے بالواسطہ اور بلاواسطہ سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ عالم اسلام کی بھلائی کے لیے بھی انگریزی حکومت کا ہندوستان سے خاتمہ نہایت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ استخلاصِ وطن کے لیے ملک کی عظیم غیر مسلم اکثریت کی حمایت ضروری تھی اور چونکہ انڈین نیشنل کانگریس ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی، لہٰذا انہوں نے سوچا ہوگا کہ پہلے متحدہ قوت سے انگریزی حکومت پر ضرب کاری لگائی جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ انہوں نے ان خطوط پر سوچا ہوگا۔ اور برادران وابنائے وطن کے ساتھ ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے اس حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی توجہات اور مساعی کو مرتکز کر دیا ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک زمانہ میں بہت بڑے انقلابی تھے، جنہوں نے ان کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں ان کو علم ہوگا کہ مولانا نے خود اعتراف کیا ہے کہ ایک زمانہ میں ملک میں جو انقلاب پسند تھے جن کو انتہا پسند (Extremist) یا جن کو دہشت پسند (Terrorist) کہا جاتا ہے۔ مولانا آزاد کا ان سے بھی کچھ عرصہ تعلق رہا ہے۔ مولانا جلد ہی ان سے الگ ہو گئے۔ چونکہ انہوں نے علی وجہ البصیرت اس طریقہ کو صحیح نہیں سمجھا اور انہوں نے کانگریس کے ساتھ استخلاصِ وطن کے لیے تعاون کیا لیکن کانگریس میں اعلیٰ مقام پر فائز رہنے کے باوجود تین باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور یقینی ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا نے اپنی وضع وقطع کو کبھی نہیں بدلا۔ کانگریس میں ہمیشہ اسی وضع کے ساتھ رہے۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے حقوق اور اسلام کے مفادات کو انہوں نے قربان کرنا تو درکنار کبھی نظر انداز بھی نہیں کیا۔ ان امور کے لیے وہ برابر مساعی اور جدوجہد کرتے رہے۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید کا جو انقلابی فکر ہے اس کو اجاگر اور مہمیز کرنے والا تحقیقی حواشی کے ساتھ اس کا ترجمہ ان کے پیشِ نظر تھا، اس پر بھی وہ برابر کام کرتے رہے۔ اس کا قدرے تفصیلی ذکر میں آگے کروں گا۔

یہ بات کون نہیں جانتا کہ مولانا آزاد کو تحریک اور نظریہ پاکستان سے اختلاف تھا۔ لیکن میں اپنی ذاتی اور عینی شہادت کی بنا پر کہتا ہوں کہ ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد نے لنچ کے لیے چند سربرآوردہ مسلمان رہنماؤں کو مدعو کیا۔ میں تو ان سب سے چھوٹا تھا اور ان حضرات کرام کے ساتھ نتھی ہوتا تھا۔ ان

حضرات میں قابلِ ذکر حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب، مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی، مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب، مولانا حفظ الرحمن صاحب سوہاروی ہیں۔ اور بھی چند اکابر اس لنچ میں شریک ہوئے جن کے نام اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں ہیں۔ بہرحال میں بھی مدعوین میں شامل تھا۔ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو اس لیے بلایا ہے کہ میں آپ حضرات سے چند خاص باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ سب نے کہا ضرور ارشاد فرمایئے۔ مولانا نے فرمایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا نظریہ پاکستان سے اختلاف تھا، وہ اپنی جگہ تھا، اس کے لیے ہمارے پاس ٹھوس وجوہ اور قوی دلائل تھے۔ لیکن اب جبکہ ملک تقسیم ہوگیا ہے اور پاکستان وجود میں آگیا ہے تو ہم کو پاکستان کے کسی لیڈر یا کسی شخص کے متعلق اپنے دل میں کوئی رنجش اور کدورت نہیں رکھنی چاہیئے۔ میرے بھائی! وقت کی ایک سیاست تھی۔ جس سیاست کو کامیاب ہونا تھا وہ ہوگئی۔ اس کے بعد پھر فرمایا، دوسری بات یہ کہ اب پاکستان کے لیے کسی طرح کی بدخواہی کرنا یا اس کے لیے کسی طرح کی بداندیشی کرنا نہ صرف ہمارے ملک ہندوستان کے لیے مضر ہے بلکہ خاص طور پر ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے بھی انتہائی مضر، مہلک اور خطرناک ہے اس واسطے کہ اگر پاکستان بھی ختم ہوگیا یا پاکستان پر کوئی زوال آیا تو پھر ہندوستان کے مسلمان منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہوجائے گا۔ ان کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ مولانا نے صاف لفظوں میں کہا کہ اب پاکستان کے ساتھ ہمارا بالکل دوسرا رویہ ہونا چاہیئے اور ہم سب کو دعا کرنی چاہیئے اور تمنا کرنی چاہیئے کہ پاکستان پھلے پھولے اور مستحکم ہو۔ سیاسی اعتبار سے ہماری حکومت بھی کہتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ایک (Region) ایک ہی خطہ کے دو ملک ہیں اس (Region) کی سلامتی اور خوشحالی اسی پر موقوف ہے کہ دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی طرح مل جل کر رہیں اور دونوں ملکوں میں خیر سگالی اور خیر اندیشی کے جذبات پروان چڑھیں۔ بھارت کی حکومت کی طرف سے تو یہ ایک سیاسی بات بھی ہوسکتی تھی۔ لیکن میں مولانا آزاد کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ تنہائیوں میں ہم سے بڑی شدت اور خلوص کے ساتھ یہ کہا کرتے تھے کہ

اب پاکستان سے کوئی اختلاف ہمیں نہیں ہونا چاہیئے جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، تو ان کے متعلق مولانا برملا کہا کرتے تھے کہ ہماری زندگی کے دو حصے ہیں ایک دینی اور ثقافتی زندگی اور ایک ہے ہماری قومی اور سیاسی زندگی۔ تو جہاں تک ہماری دینی اور ثقافتی زندگی کا تعلق ہے، میں صاف لفظوں میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس میں کوئی Compromise نہیں ہو سکتا۔ اس موقعہ پر مولانا بے ساختہ ہاتھوں کو جھٹک دیا کرتے تھے۔ اور تکرار کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے۔ اپنی ثقافت پر قائم رہیں گے۔ اس معاملہ میں ہم کسی کے ساتھ کسی نوع کا بھی سمجھوتہ نہیں کریں گے لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے مولانا نے کہا کہ میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کہتا ہوں کہ جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں الگ سیاست کا میدان بنانا ان کے حق میں مفید نہیں ہوگا۔ لہٰذا فرقہ وارانہ سیاست کو چھوڑ کر آپ لوگ اب ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لیں۔ مولانا کو جب بھی موقعہ ملتا وہ مسلمان لیڈروں کو اسی کی تاکیدی نصیحت کیا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کبھی بھی مولانا کی زبان سے نہ جلوت میں نہ خلوت میں کوئی بدخواہی کی بات نہیں نکلی بلکہ وہ برملا کہا کرتے تھے کہ اب پاکستان کو لازماً باقی رہنا چاہیئے۔ اسے مضبوط اور خوشحال ہونا چاہیئے یہی بات اس کے لیے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مفید اور بہتر ہے۔

مولانا آزاد کے متعلق میں عینی شاہد اور ذاتی معلومات کی بنا پر آپ کو بتاتا ہوں کہ دو چیزیں ان کے اندر نہایت ہی لاجواب تھیں پہلی یہ کہ اپنے مخالف کو کبھی برا بھلا کہنا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ مولانا کے متعلق لوگوں نے کیا کچھ نہیں کہا ان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک مرتبہ بھی کبھی میں نے مولانا کی زبان سے قائداعظم یا لیاقت علی خان یا مسلم لیگ کے کسی دوسرے لیڈر یا خود مسلم لیگ کے متعلق بدگوئی سنی ہی نہیں۔ ان میں اس قدر وسعت ظرف تھی کہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے کبھی غیبت نہیں کرتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ ان کے اندر خودداری نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اس کا ایک واقعہ میں آپ کو بتلاؤں۔ قرآن مجید کے ترجمہ کی "ترجمان قرآن" کے نام سے جو پہلی جلد شائع ہوئی تھی تو اس کے کاتب تھے مولانا عبدالقیوم۔ بعد میں وہ ہمارے رسالہ برہان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا کا بالی گنج میں جو مکان

تھا وہیں انہوں نے مولانا عبدالقیوم کو کتابت کے دوران رہنے کے لیے بلا لیا تھا۔ جہاں وہ نو دس مہینے مقیم رہے۔ ان نو دس مہینوں کے قیام میں مولانا عبدالقیوم جو مشاہدات بیان کرتے ہیں، وہ بڑے عجیب و غریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا کی بالی گنج میں جو دو منزلہ کوٹھی تھی، میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔ تو جب مولانا پر افلاس اور فقر و فاقہ کا دور آیا تو مولانا آزاد نے اس کا اوپر کا حصہ کرایہ پر دے دیا یا نیچے کا۔ یہ مجھے اس وقت یاد نہیں۔ بہرحال کوٹھی کا ایک حصہ کرایہ پر دے دیا اور ایک حصہ میں خود رہائش رکھی۔ مولانا عبدالقیوم بتاتے تھے کہ ہم نے کئی بار دیکھا کہ دوپہر کو کھانے کا وقت ہو گیا اور مولانا کے گھر میں چولھا نہیں جلا۔ معلوم ہوا کہ مولانا کے گھر کھانا نہیں پکا۔ ایسے حالات میں مولانا اپنے ذاتی ملازم کو بلاتے اور خاموشی سے اسے چونّی دیتے اور اس سے بازار سے سالن روٹی منگاتے اور مولانا اور ان کی اہلیہ اسی میں گزارا کر لیتے۔ یہ وقت بھی مولانا پر گزرا ہے۔

ایک دن پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی مولانا آزاد کی کوٹھی پر ان سے ملنے کے لیے آئے تو مولانا آزاد اس وقت کھدر کا جو کرتہ پہنے ہوئے تھے وہ مونڈھے کے اوپر سے پھٹا ہوا تھا تو اسی کرتے کو پہنے ہوئے مولانا ان حضرات سے ملے۔ مگر انہوں نے مونڈھے پر ایک چادر ڈال لی۔ ان حضرات نے مولانا سے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آج کل آپ مالی مشکلات سے دوچار ہیں، اس ضمن میں ہم آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ مجھے کسی تعاون کی ضرورت نہیں ہے اور ان حضرات کے اصرار کے باوجود مولانا نے کوئی امداد قبول نہیں کی ——— مولانا خیرالدین مرحوم، جو مولانا آزاد کے والد ماجد تھے، کلکتہ میں میمن اور دہلی اور یوپی کے تاجر حضرات کی ہو کلکتہ میں تجارت کرتے تھے، ان کی بہت بڑی تعداد ان کی مرید تھی۔ مولانا آزاد کے والد کے انتقال کے بعد ان کے مختلف وفود نے مولانا آزاد سے اصرار کیا کہ آپ اپنے والد مرحوم کی گدی سنبھالیے ہم آپ کی وہی تعظیم و تکریم اور خدمت کریں گے جو آپ کے والد بزرگوار کی کیا کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے صاف کہہ دیا کہ وہ راہ میرے والد کی راہ تھی، میں اس راہ کا آدمی نہیں ہوں۔ میں اس نوع کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو آپ کی خدمت میں وعظ و نصیحت کے کچھ کلمات سننے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ تو مولانا نے کہا کہ اس مقصد کے لیے میں ہفتہ میں دو دن پیر اور جمعرات آپ کو دیتا ہوں۔

عصر سے کر مغرب تک آپ لوگ تشریف لا سکتے ہیں مگر ساتھ ہی تاکید کی کہ میں کسی قسم کا کوئی نذرانہ، کسی قسم کا کوئی عطیہ آپ حضرات سے قبول نہیں کروں گا۔ الغرض ان کی بے نیازی اور ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ خود تکلیف اٹھاتے تھے لیکن کسی سے نذرانہ یا عطیہ قبول نہیں کرتے تھے، یہ ان کا مستقل مزاج تھا ــــــ پھر ان کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ میں بارہ چودہ سال تک بارہا ان کی نجی صحبتوں میں شریک رہا ہوں لیکن میں نے کبھی کسی کے متعلق ان کی زبان سے کوئی برا کلمہ یا شکوہ و شکایت کا جملہ نہیں سنا۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے وہ واقعہ سنا ہوگا کہ جب تحریکِ پاکستان کا بہت زور تھا اور یہ تحریک اپنے شباب پر تھی تو اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد دہلی سے الہ آباد جا رہے تھے جب ان کی گاڑی علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچی تو علی گڑھ یونیورسٹی کے چند طلبا نے مولانا کے ساتھ گستاخی کا معاملہ کیا اور مولانا کے ساتھ نہایت نازیبا حرکات کیں۔ پنڈت سندر لال کا بیان ہے کہ ہم نے جب دوسرے دن اخبارات میں پڑھا کہ علی گڑھ اسٹیشن پر مولانا آزاد کے اوپر کیک حملہ ہوا اور ان کے ساتھ اہانت آمیز حرکات کی گئی ہیں تو میں فوراً الہ آباد پہنچا تاکہ میں مولانا سے اس واقعہ پر اظہارِ افسوس کروں اور ان کی دلجوئی کروں۔ پنڈت جی کا بیان ہے کہ میں نے جاتے ہی کہا مولانا! بڑے افسوس کی بات ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ نے آپ کے ساتھ یہ حرکت کی۔ مولانا بجائے غصہ کے کچھ مسکرائے اور اسی حالت میں کہا کہ پنڈت جی کیا کیا جائے۔ اپنی ہی اولاد ہے، اپنے ہی بچے ہیں۔ شرارت کے کیا ہی ہے میں ہوگئی شرارت۔ اب اس پر افسوس سے کیا حاصل، ہم کو کام تو ان ہی سے لینا ہے۔ الغرض مولانا نے اس پر اپنے کسی غم و غصہ کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ کوئی ناگواری ان کے اوپر طاری نہیں تھی۔ اور وہ اس افسوسناک واقعہ کو بھی پی گئے اور ٹال گئے تھے ــــ تو یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد اپنے کیریکٹر کے اعتبار سے اور اپنے اخلاق کے اعتبار سے۔

اب میں مولانا آزاد کے ان اہم کاموں کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں جو آزادی کے بعد مولانا نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے انجام دیے تھے ہندوستان میں مسلمانوں کے جو ثقافتی مراکز تھے مولانا نے ان کو محفوظ رکھنے اور ان کو ترقی دینے کی بڑی کوشش کی چنانچہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن جو عربی کے نادر

ملفوظات کی اشاعت کا ایک نامور ادارہ ہے اسے مولانا مرحوم نے قائم رکھا اور نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس زمانہ میں اس کی ساٹھ ہزار روپے ماہوار گرانٹ مقرر کرادی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ادارہ تقسیم سے پہلے جس طرح جاری تھا اس سے کہیں ترقی کے ساتھ وہ اب بھی جاری ہے۔ اسی طرح ریاست رام پور کا شاندار کتب خانہ جس کا نام رضا لائبریری ہے، اس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ تقسیم کے بعد یہ اجڑ جائے گا۔ مولانا آزاد نے اس کو باقاعدہ حکومت کی تحویل میں لے لیا اور اسے یوپی گورنمنٹ کی نگرانی میں دے دیا اللہ کا شکر ہے کہ یہ لائبریری ترقی کر رہی ہے اور اس کا لاکھوں روپے کا سالانہ بجٹ یوپی کی حکومت پورا کر رہی ہے اسی طرح پٹنہ کی مشہور عام خدا بخش لائبریری کو بھی مولانا کی کوششوں سے حکومت کی طرف سے تمام حفاظتی انتظامات مہیا کیے گئے اور اس کے لیے بھی مولانا نے لاکھوں روپے کے سالانہ بجٹ کی منظوری حاصل کی۔ یہ ادارہ بھی نہ صرف باقی ہے بلکہ ترقی پذیر ہے اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ ہے، اس کو بچانے میں مولانا آزاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہاں مولانا نے آزادی کے بعد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ عربی کے شعبہ کو کافی ترقی دی۔ اسلامیات کے شعبہ کو وسیع تر کیا۔ اور آج اگر آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ ہندوستان یعنی بھارت ہی کی نہیں بلکہ ایشیا کی ان عظیم الشان یونیورسٹیوں میں سے ہے جن پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس کی ترقی میں بہت بڑا دخل مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ کم و بیش یہی صورتِ حال جامعہ ملیہ دہلی کی ہے اور بھارت کی ایک مثالی یونیورسٹی کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ مزید براں کئی دینی مدرسے اور ثقافتی مراکز مولانا کی کوششوں سے شرارت پسندوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔ الغرض مولانا ابوالکلام آزاد نے آزادی کے بعد نہایت نامساعد حالات میں بھارت میں مسلمانوں اور اسلام کی خدمت بڑی جرأت، دلیری، ہمت اور بہادری کے ساتھ کی ہے۔

علمی طور پر مولانا کے بہت عظیم الشان کارنامے ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا اور عظیم ترین کارنامہ ہے "ترجمان القرآن" جو مولانا کی تفسیر ہے۔ اس کو تفسیر کے بجائے ترجمہ اور اس پر مفصل حواشی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہ ہے جس کے متعلق مولانا آزاد نے خود اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اب تک جتنے

بھی تراجم کیے جا چکے اور تفاسیر لکھی جا چکی ہیں، یہ کام اب تک کسی نہ کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تفسیر کے جتنے بھی ادوار ہیں، ان میں پہلا دور ہے تفسیر ماثور کا۔ تفسیر ماثور کے معنی ہیں "تفسیر قرآن احادیث کے ذریعہ سے" جیسا کہ ابن جریر طبری کی تفسیر ہے۔ یہ ایک اہم چیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے جس کی طرف امام احمد ابن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اشارہ کیا ہے، کہ اس کے اندر درج شدہ روایتوں کی جانچ پرکھ میں وہ احتیاط اور سختی نہیں برتی جاتی جو برتنی چاہیے امام احمد ابن حنبل نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے پیش نظر احادیث کو نہایت احتیاط سے قبول کرنا چاہیئے ایک ملاحم۔ دوسری مغازی اور تیسری تفسیری روایات۔ امام موصوف نے فرمایا کہ ایسی احادیث جرح و تعدیل اور جانچ پرکھ کے بغیر تفسیر میں داخل کر دی جاتی ہیں جن کی وجہ سے قرآن مجید کے مطالب اور مقصود میں انتشار و اختلال پیدا ہو جاتا ہے دوسری بات میں عرض کروں، وہ یہ کہ ضعیف روایات کے علاوہ تفسیر ماثور میں اسرائیلیات نے بہت راہ پالی ہے۔ اسرائیلیات وہ روایتیں ہیں جو قدیم محرف کتب سماویہ کے مطابق ایک طبقہ نے عام طور پر مسلمانوں میں پھیلا دی ہیں۔ ان پر ہمارے قدیم و جدید علماء نے بڑی تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ ان اسرائیلیات کا نہایت ہی قلیل حصہ ایسا ہے جس کے متعلق علماء یہ کہتے ہیں کہ ان کو درج کیا جا سکتا ہے چونکہ وہ ہماری کسی منصوص اور صحیح روایت سے معارض نہیں ہیں۔ لیکن ان اسرائیلیات کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جو قابل رد ہے اور جو درحقیقت قرآن مجید کے اوپر ایک نوع کی تعدی اور زیادتی کا حامل ہے مثلاً ہاروت و ماروت کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان کے بارے میں اسرائیلیات کی ایک عام روایت ہے جس کے متعلق نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں، کہ ہمارے شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ جو کہ بہت بڑے محدث ہیں یقیناً ان کا مقام بہت بلند ہے ان کی جو تفسیر عزیزی ہے اس میں انہوں نے اس کو نقل کر دیا ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے جو زمین پر دو عورتوں پر عاشق ہو گئے جن کا نام تھا زہرہ اور مشتری۔ وہ جانتی تھیں کہ ان دونوں فرشتوں کے پاس اسم اعظم ہے۔ تو انہوں نے ان سے کہا کہ ہم تم کو اس وقت اپنے قرب اور وصل سے شاد کریں گی جب تم اسم اعظم ہمیں سکھلا دو۔ پس انہوں نے اسم اعظم ان کو سکھلا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ

وہ عورتیں آسمان پر چلی گئیں ایک زہرہ ستارہ اور دوسری مشتری ستارہ بن گئی اور بے
ہاروت وماروت تو ان کو ایک اندھیرے کوئیں میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح
کوئی شخص ان کو سن سکتا اور برداشت کر سکتا ہے۔ ایک نہیں بے شمار اسرائیلیات ہیں
جن کو عقل عام بھی سننا گوارا نہیں کرتی چہ جائیکہ ان کو تفسیری روایات کے طور پر جگہ دی
جائے۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق حضرت سلیمان کے متعلق، جنت ودوزخ سے متعلق،
حضرتِ آدم کے جنت سے نکلنے کے متعلق وغیرہ وغیرہ اس قسم کی روایتیں ہیں کہ سمجھ
میں نہیں آتا کہ کوئی سمجھدار آدمی کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس قسم کی روایات تفسیر میں لائے
مگر یہ ہوا۔ اور اکثر تفسیر ماثور کا یہی حال ہے ۔۔۔ اس کے بعد جب علم کلام کے مختلف
مذاہب یا فقہ کے مذاہب وجود میں آئے تو ان کے بعد جو تفاسیر لکھی گئی ہیں۔ اگر
کوئی ماتریدی ہے تو اس نے اپنے عقیدے کے مطابق لکھی ہے اگر کوئی اشعری ہے تو اس
نے اپنے عقائد کے مطابق لکھی ہے۔ اگر کسی حنفی نے لکھی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارا
قرآن شریف امام ابوحنیفہ کے مذہب پر نازل ہوا تھا۔ یہی حال دوسرے فقہی مسالک
کے مفسرین کا نظر آتا ہے الا ماشاء اللہ۔ اور یہ سلسلہ سلف سے لے کر اب تک جاری
ہے ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید ان سب چیزوں سے بلند ہے۔ قرآن کی تفسیر
تو اس طرح لکھی جانی چاہیئے اور اس طرح سامنے آنی چاہیئے کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کسی
خاص علم کلام یا کسی خاص فقہی مکتب فکر کا پابند ہے۔ امام رازی کی تفسیر میں منطق اور
فلسفہ کا ... ہے کہ ان کی تفسیر کے متعلق یہ قول مشہور ہو گیا ہے کہ تفسیر کبیر میں
سب کچھ ہے سوائے قرآن کے ... مولانا آزاد نے اس صورت حال کا اپنے مقدمہ میں ذکر
کیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر علماء منطق اور فلسفہ سے بڑی
دلچسپی رکھتے ہیں فقہ سے بڑا شغف رکھتے ہیں حدیث سے بھی دلچسپی موجود ہے لیکن
اگر دلچسپی نہیں ہے تو قرآن سے معارف، اس کے عرفان، اس کی جاودان انقلابی دعوت
اس کے حقیقی پیغام کی طرف التفات کم سے کم ہے الا ماشاء اللہ۔ مولانا آزاد نے ترجمان
القرآن میں اس بات کی رعایت ملحوظ رکھی کہ قرآن جو بات جس طرح جس مقام پہ کہتا
ہے اسے اسی طرح مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس سے بعض غلط فہمیاں
بھی پیدا ہوئیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں جہاں وہ آیت ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ

هَادُوا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور غلام احمد پرویز صاحب نے طلوع اسلام کے ذریعہ اس کو خوب اچھالا چونکہ مولانا نے اس آیت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اگر مولانا آزاد اس کے حاشیہ میں یہ لکھ دیتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد ایمان کا مفہوم بالکل متعین ہو گیا ہے اور اب اس کا مفہوم یہ ہے۔ نجاتِ اخروی کے لیے اب آں حضور پر ایمان لانا لازم، لابد اور ناگزیر ہے۔ قرآن میں اکثر جہاں بھی ایمان لانے کی دعوت ملے گی وہاں عموماً ایمان کی تفاصیل نہیں ملیں گی۔ اٰمِنُوْا، میں ان تمام امور پر ایمان لانا ضروری ہو گا جن پر جگہ جگہ قرآن ایمان لانے کی مختلف اسالیب سے دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا ایمان کی تعریف ہی یہ قرار پا گئی ہے کہ اللہ پر ایمان اس کی توحید کے ساتھ اس کی صفات کمال پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان، جزا و سزا پر ایمان، جنت و دوزخ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، وحی پر ایمان، کتابوں پر ایمان، نبوت و رسالت پر ایمان اور اس پر ایمان کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور آخری رسول ہیں اور قیامت تک آپ ہی کی دعوت رسالت کا دور جاری و ساری رہے گا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مولانا آزاد ان تمام باتوں کو مانتے تھے۔ لوگوں نے مولانا سے پوچھا۔ تو مولانا نے جواب دیا کہ میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت اور قرآن کے نزول کے بعد اب نجاتِ اخروی کا دار و مدار صرف حضورؐ کا اتباع اور آپؐ کی اطاعت اور قرآن کی پیروی پر ہے۔ آپ سے پہلے کے رسولوں پر ایمان اور سابقہ کتب سماوی پر ایمان اور ان کے مطابق عمل سے اب نجاتِ اخروی نہیں ہو گی۔ پھر مولانا سے سوال کیا گیا کہ آپ نے یہاں یہ بات لکھی کیوں نہیں! تو مولانا نے جواب دیا کہ اس مقام پر آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے میں نے اتنی بات پر ہی وہاں اکتفا کیا ہے، لیکن میں اس کو اس کے مناسب مقام پر مفصل طور پر بیان کروں گا اور اس کی وضاحت کروں گا۔ آپ کے اسی شہر لاہور سے مولانا غلام رسول مہر اور ان کے ساتھ چند دوسرے حضرات مولانا آزاد سے جا کر ملے تھے اور اسی مسئلہ پر ان سے سوالات کیے تھے مولانا آزاد نے وہی جوابات دیے تھے جن کو میں بیان کر چکا ہوں۔

یہ سوالات وجوابات "میرا عقیدہ" کے نام سے اسی زمانے سے مطبوعہ موجود ہیں۔ جس میں مولانا آزاد نے صاف لفظوں میں کہا ہے میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔

پھر مولانا آزاد نے سورہ فاتحہ کی جو تفسیر لکھی ہے وہ کس قدر اہم ہے۔ اس میں مولانا کی ادبیت اور اندازِ خطابت عروج پر ہے۔ بلاشبہ وہ مولانا آزاد کا شاہکار ہے۔ مولانا آزاد کا ذہن وفکر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید امام حافظ ابن قیم علیہ الرحمۃ سے شروع ہی سے بہت متاثر تھا۔ ان دونوں ائمہ سلف کے افکار کا مولانا آزاد کے دماغ پر بڑا غلبہ تھا۔ مولانا آزاد کا جو اپنا ذاتی عظیم الشان کتب خانہ تھا، میں نے وہ کتب خانہ خود دیکھا ہے۔ اس میں علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کی تقریباً تمام تصانیف موجود تھیں علامہ ابن تیمیہ نے سورۃ التین اور سورۃ العصر کی بڑی جامع اور بڑی عجیب وغریب تفسیر کی ہے۔ مولانا آزاد کے سامنے ان اکابر کے تمام اہم مباحث تھے جن سے مولانا کافی متاثر تھے۔ لہٰذا سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے اللہ کی ربوبیت، اس کی رحمت اور اس کی ہدایت پر جو بحثیں کی ہیں اگر آپ علامہ ابن تیمیہؒ کی تفاسیر محولہ بالا کو دیکھیں گے تو ان مباحث کا سررشتہ آپ کو ان کے یہاں مل جائے گا۔ لیکن مولانا آزاد کا اپنا خاص اسلوبِ نگارش ہے جو دل کو موہ لیتا ہے اور اس کے مطالعہ سے ذہن و قلب پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا آزاد نے اپنے ترجمہ میں یہ خاص بات پیش نظر رکھی ہے کہ جو تاریخی اہم مباحث قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں ان پر مولانا نے کافی تحقیق کے بعد بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ مثلاً ذوالقرنین کون تھے؟ ذوالقرنین کے متعلق ہمارے متقدمین نے یہ لکھا ہے کہ اس سے سکندر مقدونی مراد ہے۔ حالانکہ قرآن کا معمولی طالب علم بھی بہ ادنیٰ تامل یہ جانتا ہے کہ ذوالقرنین کے نام سے قرآن میں جس شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک خدا آشنا اور خدا ترس شخصیت تھی جبکہ سکندر مقدونی ان اوصاف سے صرف محروم ہی نہیں بلکہ ان کے بالکل برعکس اوصاف کا حامل تھا۔ مولانا آزاد نے اس مسئلہ پر بڑی دقیق تحقیق کی ہے اور بڑی تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ ذوالقرنین سکندر مقدونی ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ ایران کا ایک نیک خصلت بادشاہ کیخسرو تھا۔ مولانا آزاد کی اس تحقیق پر مولانا کے ہم عصر ایک صاحب علم نے ایک مضمون لکھا اور اس پر کچھ شکوک وارد کر دیے۔ محض شکوک وارد کرنے سے تو کام نہیں بنتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ذوالقرنین

کچھ نہیں ہے تو آپ کے خیال میں وہ کون سی شخصیت تھی اس کے لیے آپ کی تحقیق اور دلائل کیا ہیں؟ وہ یہ کام تو کر نہ سکے البتہ شکوک وارد کر دیے ــــ غرضیکہ ذوالقرنین کے متعلق تحقیق مولانا آزاد کا بہت بڑا کارنامہ ہے ــــ اسی طرح قرآن مجید میں اصحاب کہف کا ذکر آتا ہے تو وہاں دو چیزیں بہت اہم ہیں ایک تو یہ کہ جس کہف کا قرآن میں ذکر ہے وہ کہاں پر واقع ہے! قرآن نے محض کہف کو کہف کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اس کی ایک خصوصیت بھی بتائی ہے کہ یہ کہف اس طرح واقع تھا کہ وہاں دھوپ نہیں آتی تھی۔ اس کی پوزیشن اس طور پر تھی۔ دوسری یہ کہ وہاں رقیم کا لفظ آیا ہے۔ اب یہاں رقیم سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے بعض اصحاب نے یہاں تک لکھ دیا کہ اصحاب کہف کے ساتھ جو کتا تھا اس کا نام رقیم تھا۔ یہ کتنی لغو اور بے سروپا بات ہے۔ اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ کہف کہاں تھا اور رقیم سے مراد کیا ہے! چونکہ مستشرقین قرآن مجید میں بیان کردہ ایسے واقعات کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ سنی سنائی باتیں اور داستانیں پیغمبر اسلام نے قرآن مجید میں درج کر دیں۔ ان کی تاریخی حقیقت کوئی نہیں ہے۔ تو مولانا آزاد نے اس کا بڑا اہتمام کیا کہ قرآن مجید میں تاریخی واقعات کے متعلق جو کچھ بھی آیا ہے اسے اپنی تحقیق کے ذریعہ مکمل طور پر ثابت کریں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔ اس بنا پر مولانا آزاد نے کہف کے متعلق بڑی تحقیق کی۔ انہوں نے آثار قدیمہ کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنا یہ نظریہ قائم کیا کہ اردن میں عمان کے پاس جو پہاڑیاں ہیں، ان میں بے شمار کہف یعنی غار پائے جاتے ہیں۔ ان ہی میں ایک کہف (غار) ایسا ہے جو بالکل اسی کہف کا مصداق ہے جس کا قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ پھر جہاں تک رقیم کا تعلق ہے تو مولانا نے اپنی تحقیق کے نتیجہ میں لکھا ہے کہ فلاں زمانہ میں ایک پادری کو ایک ذریعہ سے ایک غار میں مٹکہ میں رکھے ہوئے کچھ کاغذات ملے تھے۔ مولانا نے ان کاغذات کی دستیابی کی پوری داستان لکھی ہے آپ اس کو پڑھیں۔ مولانا آزاد کا کمال اصل میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیقات اس وقت لکھی تھیں جبکہ کہف اور رقیم کے متعلق تحقیق کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ تحقیقات مکمل ہو گئی ہیں جو مولانا آزاد کے نظریات کے مطابق ہیں جو مولانا نے اپنے دقیق اور تحقیقی مطالعہ سے قائم کیے تھے۔ چنانچہ اردن کے ایک

بہت بڑے فاضل ہیں جو ندوۃ العلماء کے جشن میں لکھنو تشریف لائے تھے۔ پھر دہلی بھی آئے۔ مجھ سے ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ یہ تحقیق مکمل ہوگئی ہے کہ اردن میں عمان کی پہاڑیوں میں وہ کہف موجود ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے اور رقیم کا بھی پتہ چل گیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے اس موضوع پر تمام تحقیقاتی کام پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ افسوس کہ وہ کتاب تاحال میرے مطالعہ میں نہیں آئی گو انہوں نے مجھ سے کتاب بھیجنے کا وعدہ کیا تھا لیکن شاید وہ بھول گئے۔ بہرحال مجھے اپنے چند احباب سے تصدیق حاصل ہوگئی کہ کتاب شائع ہو چکی ہے ـــــ مولانا آزاد کا یہ تحقیقی کام وہ چیز ہے کہ جو انتہائی قابلِ ستائش ہے۔ پھر صرف اس پہلو ہی سے نہیں بلکہ اور بھی بے شمار پہلوؤں سے مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن انتہائی قابلِ قدر خصوصیات کی حامل ہے۔

مولانا آزاد کی اس تفسیر کے اب تک بیس پارے شائع ہوئے ہیں دس پارے جو باقی رہ گئے، ان کی داستان یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں اور میں بھی ان ہی کے اندر شامل ہوں کہ مولانا آزاد نے بتلایا تھا کہ انہوں نے ان پاروں کی تفسیر مکمل کر دی ہے۔ میں نے یہ بات خود اپنے کانوں سے سنی ہے۔ لیکن وہ شائع نہیں ہوئی اور اب تک یہ پتہ بھی نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ مولانا آزاد کا ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا تھا اور یہ انتقال تین دن کے "کوما" (بے ہوشی) کے بعد ہوا تھا۔ مولانا کے یہ تین دن جو کوما میں گزرے تھے ان میں ان کی کوٹھی میں مختلف لوگ آتے جاتے رہے۔ ان کے سامان وغیرہ کو [illegible] ہے کہ بعض لوگوں نے مولانا کے بہت سے [illegible] غائب کر دیا جن میں آخری دس پاروں کی تفسیر بھی شامل تھی چونکہ مولانا خود فرما چکے تھے کہ انہوں نے اس کی تکمیل کر لی ہے۔ واللہ اعلم

بہرحال مولانا آزاد کی جو شخصیت ہے اور ان کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک خاص مشن کے آدمی تھے۔ ان کی دعوت وہی تھی جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی دو تقریروں میں اشارات کیے ہیں[1] لیکن ایک تو وہ مسلمانوں سے مایوس ہو گئے یعنی انہوں نے

---

[1] یہ تقاریر "جہاد بالقرآن" اور "اسلامی انقلاب کے لیے التزام جماعت اور [illegible] بیعت" کے عنوانات سے شائع ہو چکی ہیں۔ (مرتب)

محسوس کیا کہ مسلمانوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ میری تحریک کا ساتھ دیں اور اس کے ساتھ چلیں اور دوسری طرف انہوں نے یہ دیکھا کہ انگریز عالم اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے اگر اس کو ہندوستان کی حکومت سے بے دخل کر دیا جائے تو اس کی کیفیت پر کٹے پرندے کی ہو جائے گی ــــ ممکن ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ان میں تعاون سے محرومی کا بھی احساس پیدا ہوا ہو جس کی علمائے دیوبند کی اکثریت سے ان کو توقع ہو سکتی تھی ــــ اس لیے انہوں نے استخلاص وطن کی جدوجہد کو اپنی جولان گاہ بنایا ہو ــــ واللہ اعلم

البتہ یہ بات کہ مولانا آزاد کے پیش نظر آغاز میں تجدید دین اور احیائے اسلام ہی کا کام تھا جس کے لیے قرآن مجید ہی کو انہوں نے اپنی دعوت کا مرکز و محور بنایا تھا جس کا تذکرہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی تقریر میں کیا ہے اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر دو رائیں ممکن ہی نہیں ہیں۔ رہی یہ بات کہ جمعیت العلماء ہند نے جمعیت کے اجلاس میں مولانا آزاد سے اختلاف کیا جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر صاحب نے اشارہ کیا ہے تو میں خود تو اس اجلاس میں موجود نہیں تھا لیکن میں نے جو کچھ اپنے دوستوں اور بزرگوں سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جمعیت العلماء کا ایک جلسہ دہلی میں ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا جس میں اس بات کی تجویز زیر غور آئی تھی کہ مولانا آزاد کو امام الہند بنا دیا جائے اور اس جلسہ میں مولانا نے بڑی پُرجوش تقریر کی۔ تقریر اتنی پرجوش، ولولہ انگیز اور مدلل تھی کہ سب لوگ اس کے لیے تیار ہو گئے لیکن ہمارے دیوبند کے اکابر میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند دونوں اس تجویز کے حامی نہیں تھے غالباً ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری بھی ان کے ہم نوا تھے۔ میری معلومات کی حد تک ان کے حامی نہ ہونے کی وجوہ دو تھیں ایک تو یہ کہ ان اکابر کے نزدیک امام الہند ہونے کے لیے صرف علم و فن، خطابت اور تحریر اور ذہانت و فطانت اور طباعی کافی نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ اور طہارت بھی ہونی چاہیئے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا آزاد کا باوجود اپنے علم و فضل کے تقویٰ و طہارت میں وہ مقام نہیں تھا جو ہمارے علمائے دیوبند اور ہماری دوسری دینی درس گاہوں کے

مشائخ کا تھا۔ صاف بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کو اس بات کا احساس و ادراک ہی نہیں تھا اگر ہوتا اور وہ سجادہ نشین ہو کر بیٹھ جاتے تو آپ دیکھتے کہ ان کے والد سے سو گنا زیادہ لوگ ان کے مرید ہو جاتے چونکہ ان کے والد ماجد میں خطابت نہیں تھی، ادبیت نہیں تھی، خاص علمیت نہیں تھی جبکہ اللہ نے مولانا آزاد کو اس سے خوب نوازا تھا لیکن انہوں نے اس راستہ کو اختیار ہی نہیں کیا۔ پھر یہ کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا مثلاً وہ سگریٹ پیتے تھے تو یہ نہیں کہ چھپ کر پئیں۔ سب کے سامنے پیتے تھے ظاہر بات ہے کہ تقویٰ کے اعتبار سے مولانا کا کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ لہذا ہمارے چند علماء نے ان کے امام الہند بنانے کی حمایت نہیں کی تو اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اس کے لیے تقویٰ و طہارت کی بھی ضرورت ہے اور مولانا آزاد میں اس کی کمی تھی۔

دوسری بات یہ کہ علماء متردد تھے کہ ان حالات میں کیا واقعی امام الہند کا منصب قائم کرنا چاہیئے! اس لیے کہ ان کے نزدیک امام وہ ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں قوتِ تنفیذ ہو۔ یعنی محض زبانی بنا دینے سے تو کوئی امام نہیں ہو جاتا۔ ایسے شخص کو آپ اپنا رئیس، سردار کہہ سکتے ہیں۔ لیکن امام تو خلیفہ کے مترادف منصب ہے اور جب تک قوت تنفیذ نہ ہو کسی کو امام قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ غلام ہندوستان میں اگر مولانا کو امام بنا دیا تو اس کا مقام وہی ہوگا جیسے ایک لیڈر کا ہوتا ہے لیکن اسلام میں امام کا جو مفہوم ہے وہ تو ادا نہیں ہوگا لہذا مولانا کو امام الہند بنانے کی تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی ـــــ مولانا معین الدین اجمیری کے متعلق جو بات سامنے آئی ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن اگر مولانا نے ایسی بات کہی بھی ہو تو کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے منطقی اور فلسفی تھے آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ منطقی اور فلسفی ہوتے ہیں وہ بات کہنے میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے۔ بسا اوقات وہ ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں جو ان کو کہنی نہیں چاہیئے۔ اگر انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ پھر ایک بات، اور وہ یہ کہ دنیا میں اگر کسی شخص کا کوئی مخالف نہیں ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ بڑا آدمی ہے ہی نہیں۔ کوئی شخص بڑا آدمی اس وقت بنتا ہے جب کچھ لوگ اس کے مخالف ہوں۔ یہ تو لازمی بات ہے۔ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جو عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی نئی راہ

پیش کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ راستہ جس پر لوگ اندھا دھند چلے جا رہے ہیں، اس میں آگے کتنے خطرات ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، کیا پیش آنے والا ہے۔ کیسی آندھی آنے والی ہے۔ وہ ان کو دیکھ کر قوم کو خبردار کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے شخص کو ایک نئی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ نیا اسلوب اپنانا ہوگا۔ اس وقت کے جو عوام ہوتے ہیں وہ اس کے متحمل نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کے دلوں میں بیزاری پیدا ہوتی ہے لیکن جو لوگ زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ داعی کتنی دور کی بات کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے مستقبل میں کیا دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک قافلہ بننا شروع ہو جاتا ہے اور وہ قافلہ ابتدا میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن اگر استقامت سے دعوت کا کام جاری رکھا جائے۔ اور مخالفتوں سے دل برداشتہ ہو کر ہمت نہ ہاری جائے اور اپنے موقف پر داعی ڈٹا رہے اور اپنی دعوت پیش کرتا رہے اور لوگوں کو تجربہ ہو کہ جس دعوت کو لے کر یہ لوگ اٹھے ہیں اس میں یہ مخلص ہیں اور یہ دعوت حقہ ہے تو اگر داعیوں میں استقلال اور ثابت قدمی ہو تو دعوت پھیلتی ہے اور قافلہ بڑھتا جاتا ہے یہ عام قاعدہ ہے تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد نے جب یہ محسوس کیا کہ جو اصل دعوت ان کے پیش نظر ہے، اس کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں ہیں تو انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ لیکن وہ بھی نہ صرف مسلمانانِ ہند کے مفاد میں تھا بلکہ پورے عالم اسلام کے مفاد میں بھی تھا اس لیے کہ انگریز کے پنجۂ استیلا میں تقریباً پورا عالم اسلام بالواسطہ یا بلاواسطہ گرفتار تھا۔ ہندوستان میں انگریز کی حکومت کے خاتمہ کا مطلب یہ تھا کہ اس کی گرفت کمزور ہو جائے اور دوسرے مسلمان ممالک بھی اس کی سیاسی و عسکری غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔

مولانا آزاد کے نقادوں نے مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ اس ضمن میں اصولی بات میں عرض کروں گا۔ وہ یہ کہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ "نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں"۔ مجھے بتایا جائے کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو سراپا نیکی ہو۔ سراپا تقویٰ و طہارت ہو جس کے اندر اس کے منافی کوئی چیز نہ ہو اگر یہ ہے تو قرآن نے جو کہا ہے کہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ تو اس کا کیا محل ہوگا! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس میں صرف تقویٰ پیدا کیا گیا ہے۔ فجور کا داعیہ پیدا نہیں کیا گیا۔ انسان کا کمال تو یہ ہے کہ فجور کا میلان ہو لیکن انسان شعوری طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسۂ نفس پر کوئی قدغن نہیں لگائی صحابہ کرامؓ نے کہا کہ حضورؐ ہمارے نفس میں گناہوں کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ ایسا ہونے پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے صدور سے بچنے کی کوشش کرو۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اگر گناہ کی طرف آپ کے دل میں رغبت بھی پیدا نہ ہو تو آپ انسان نہیں فرشتے ہیں۔ انسان کو فرشتوں پر جو فضیلت حاصل ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ فرشتے تو اختیار و ارادہ رکھتے ہی نہیں۔ وہ تو مشین ہیں یا اس کے پرزے ہیں لہٰذا ان کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے وہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ اس کے برعکس انسان کے اندر ارادہ ہے۔ اس کو اختیار بخشا گیا ہے۔ اس کے نفس میں تقویٰ اور فجور الہام کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جہاد کیا۔ وہ کشمکش سے دوچار ہوا ہے اس نے فجور کو چھوڑ کر تقویٰ کی روش اختیار کی ہے تو یقیناً اس کا مقام بہت بلند و ارفع ہوگا۔ ایک شخص لکھ پتی اور کروڑ پتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے کبھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تو یقیناً وہ بہت زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ لیکن ایک شخص جو نانِ شبینہ کا محتاج ہے وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتا ہے کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی تو ٹھیک ہے کام بہت اچھا ہے لیکن وہ اتنا قابلِ تعریف نہیں ہے جتنا ایک مالدار شراب سے مجتنب سمجھا جائے گا۔ ایک شخص جو نوجوان ہے۔ تندرست اور بڑا خوبصورت ہے وہ یہ کہتا ہے کہ الحمدللہ میں نے آج تک کسی عورت کی طرف بری نگاہ سے نہیں دیکھا یقیناً یہ نوجوان نہایت قابلِ تعریف ہے لیکن ایک نابینا یہ کہتا ہے کہ میں نے آج تک کسی عورت کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا تو اس نے کونسا تیر مارا۔ تو زندگی کا یہ فلسفہ ہے۔ پس اس بنا پر ہمیں ہر بڑے شخص کو اس طرح نہیں دیکھنا چاہئے کہ گویا وہ فرشتہ ہے۔ یہ تو صرف رسولوں کا خاصہ ہے کہ وہ بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے صحابہ کرامؓ کی خصوصیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا۔ کہ انہوں نے نفس کے بے قابو گھوڑے کے منہ پر لگام ڈال رکھی تھی لہٰذا ہمیں ہر بڑے شخص کو سنجیدگی کے ساتھ اس نگاہ سے دیکھنا چاہیئے کہ کسی بڑے شخص میں اچھی چیزوں کا تناسب کیا ہے! اگر ان کا غلبہ ہے تو ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظرانداز کر دینا چاہیئے۔ حاشا وکلا اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مولانا آزاد میں کسی نوع کا فجور تھا۔ معاملہ صرف

(بقیہ صا[illegible] پر)

قسط ۲

تصوف کی حقیقت

——— مولانا الطاف الرحمٰن مثنوی

پہلا اعتراض یہ تھا کہ تصوف کا نتیجہ عام طور پر الحاد و بدعقیدگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً "سبحانی" وغیرہ جیسے کلمات کہنا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ العیاذ باللہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا ہم پایہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تقدیس تو خدا تعالیٰ ہی کے شایان شان ہے۔ اس اعتراض کا جواب کسی قدر تمہید کا محتاج ہے لہٰذا پہلے اسکو ذہن نشین فرمالیجئے۔

جیسے کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضرات صحابہؓ کو نبی علیہ السلام کی صحبت حاصل تھی ان کے حضور و استحضار کی کیفیات زیادہ تر اسی صحبت کی مرہون منت تھیں وہ اپنے اپنے طور پر ذکر و فکر بھی کرتے تھے لیکن اس کے باوجود سکر کی مغلوبیاں ان پر طاری نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ صحو کی حالت میں رہتے اور حقائق کے واقعاتی ادراک میں کبھی کوئی غلطی نہ کرتے تھے، صحابہؓ کے بعد نبی علیہ السلام کی صحبت سے محرومی کی بدولت اہل سلوک پر وہ فنا بھی طاری ہوجاتی تھی جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر موجود کا وجود، ہر مشہود کا شہود اور ہر مذکور کا ذکر غائب ہوجاتا تھا۔ یہاں تک کہ ساری مخلوق اس کی نگاہ میں فنا ہوجاتی تھی اور صرف خدا باقی رہ جاتا تھا۔ اس قسم کا فنا نہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر طاری ہوا کرتا تھا اور نہ ہی اولیائے کاملین پر، ہاں اس سے نچلے درجے کے لوگوں پر طاری ہوجاتا تھا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اسی فنا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"انبیاءؑ اور اکابر اولیاءؒ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور سابقین اولین کو یہ فنا پیش نہ آئی۔ ان امور کی ابتداء تابعین رحمہم اللہ کے عہد سے ہوئی ہے اور شیوخ صوفیاء میں سے مثلاً ابویزیدؒ، ابوالحسن نوریؒ۔ ابوبکر شبلیؒ کو یہ حالات پیش آئے اور ان کے سوا ابوسلیمان دارانیؒ، معروف کرخیؒ، فضیل بن عیاضؒ بلکہ حضرت جنیدؒ کو بھی یہ صورت پیش نہیں آئی۔"

نبی علیہ السلام کی صحبت کی وجہ سے جو تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے صوفیاء کی اصطلاح میں قرب نبوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس صحبت کے بغیر محض ذکر و فکر سے جو تعلق اور

وابستگی پیدا ہوتی ہے اسکو قربِ ولایت کا نام دیا گیا ہے، ان اصطلاحات کی روشنی میں اب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دوسرے لوگوں کے تعلقات و تقربات کا فرق معلوم کرنے کے لیے حضرت مجدد صاحب کا یہ بیان سنیئے۔

"وہ قربِ خداوندی جس کا تعلق فنا و بقاء اور سلوک و جذب سے ہے، قربِ ولایت ہے اولیائے امت اس سے مشرف ہوئے ہیں اور جو قرب کہ صحابہ کرامؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاصل ہوا وہ قربِ نبوت ہے اس قرب میں نہ فنا ہے نہ بقا نہ جذب ہے نہ سلوک، اور یہ قرب قربِ ولایت سے بدرجہا بہتر ہے اسلیئے کہ یہ قربِ حقیقی ہے اور وہ قربِ ظلی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔"

اسی مقام پر ذرا آگے چل کر مزید توضیح فرماتے ہیں۔

"کمالاتِ قربِ نبوت اگر قربِ ولایت کے راستے سے طے ہوتے ہیں تو فنا و بقا اور جذب و سلوک سے چارہ نہیں اور اگر اس راستے سے کمالاتِ قربِ نبوت نہ حاصل کیے جاویں تو فنا و بقا اور جذب و سلوک کی ضرورت نہیں ہے صحابہ کرامؓ نے قربِ نبوت کے راستے سے منزل طے کی ہے جذب و سلوک اور فنا و بقا سے ان کو کام نہ تھا۔"

(مکتوبات جلد اوّل مکتوب سہ صد و سیزدہم)

حضرات گرامی! اس تمہید کے بعد اعتراض کا جواب آسان ہو گیا اور وہ یہ کہ بعض صوفیہ سے اگر اس قسم کے کلمات منقول ہیں تو وہ قربِ ولایت کے راستے سے آئی ہوئی فنا اور غلبۂ حال میں صادر ہوئے ہیں اور یہ وہ حالت ہوتی ہے جس میں باتفاق علماء وہ قطعاً معذور اور مرفوع القلم مانے گئے ہیں لہٰذا اس پر کسی کو گرفت کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

معترضین کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ تصوف تعطل اور بے عملی کا دوسرا نام ہے ایسے لوگوں کے بارے میں میرا ذاتی تأثر یہ ہے کہ یا تو چند ناپختہ کار صوفیاء کے حالات دیکھ کر اور پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تصوف بے عملی کو جنم دیتا ہے اگر ایسا ہی ہے تو ان کو اعتراض کی بجائے اپنی تن آسانی اور تساہل کا علاج کرنا چاہیئے۔ اور اگر تصوف کی تاریخ پر نظر ہے تو حقائق کا منہ چڑانے کی مذموم ترین حرکت ہے جس پر ان کو اولاً اللہ تعالیٰ، ثانیاً حضرات صوفیاءؒ اور ثالثاً تاریخ سے معافی مانگنی چاہیئے۔

حضرات! اس امت کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے تو یہ بات دوپہر کے سورج اور چودھویں کے چاند کی طرح بالکل صاف و شفاف نظر آئے گی کہ ملتِ اسلامیہ کے اندر جب کبھی کوئی علمی اور عملی فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا تو یہی لوگ سر پر کفن باندھ کر اس کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان

میں آئے جنکا باطن نورِ ایمان سے منوّر تھا۔ خلقِ قرآن کا علمی اور اعتقادی فتنہ ہو، تاتاریوں کی عملی یورش و یلغار ہو، ایمان سے بتاؤ کس نے ان طوفانوں کا منہ موڑا، امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ علوم ظاہریہ کے تبحّر و عبقریت کے ساتھ ساتھ کس پایہ کے اہلِ باطن تھے، اپنی ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں مسلمانوں کے دور کا آغاز ہی صوفیائے کرام کی ذات سے ہوا۔

حضرت خواجہ معین الدّین چشتی کے مخلص اور پُرزور ہاتھوں سے یہاں چشتی سلسلہ کی مضبوط بنیاد پڑی۔ اس کے بعد سے خواص و عوام، شاہ و رعیّت، سبھی نے ان بے غرض اور پاک نفس درویشوں اور مردانِ خدا سے اپنی عقیدت و محبّت کا اظہار کیا اور ہندوستان کے ہزاروں اور لاکھوں ہندو ان کے فیضِ صحبت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔

حضرت مجدّد الف ثانی کا مقامِ تصوّف محتاجِ بیان نہیں، اگر آپ کی مساعی جمیلہ نہ ہوتیں تو غالباً آج ہم تعالیٰ کے دین کی بجائے اکبر کے دین کے مسلمان ہوتے، آپ کے نامور خلیفہ اور صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ کے ہاتھ پر نو لاکھ انسانوں نے بیعت و توبہ کی۔

دعوت و ارشاد کی ان سرگرمیوں کے علاوہ حضرات صوفیہؒ جان بازی و جاں سپاری میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے وہ حافظ شی کے ہر موقعہ پر نہ صرف شریک ہوئے بلکہ لشکرِ اسلام کا ہراول دستہ اور صفِ اول کے مجاہدین و قائدین نظر آتے ہیں، ان آخری صدیوں پر نظر ڈالئے، امیر عبدالقادر الجزائری (مجاہد جزائر) محمد احمد السوڈانی (مہدی سوڈانی) سید احمد شریف السنوسی (امام سنوسی) اور سید احمد بریلوی (سید شہید) کو اسی میدان کا مرد پائیں گے۔

چند کور چشموں کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کی مختلف النوع درخشاں ملّی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ اس کے تمام اکابر تصوّف کی روح سے سرشار اور اسی کی قوت و حرارت سے سرگرم عمل تھے، کیا اب بھی تصوّف کو تعطّل اور بے عملی کا طعنہ دینا کسی درجے میں بھی صحیح ہو سکتا ہے۔

قابلِ قدر سامعین! تصوّف کے بارے میں اٹھائے گئے سوالات و اعتراضات کے یہ تمام علمی جوابات جو آپ نے سماعت فرمالیے، اپنی جگہ بالکل درست، لیکن اتنی لمبی چوڑی مغز ماری بھی یقیناً وہ اطمینان و تسلّی پیدا نہیں کر چکی ہوگی۔ جو کسی سچے صوفی کی ایک بہت مختصر سی صحبت پیدا کر دیتی، کاش ہمارے سامنے روشن ضمیری کا کوئی زندہ نمونہ ہوتا تو حاضرین کو "لے لقائے

تو جواب ہر سوال" کا عملی تجربہ کراتے۔ آج بھی اگر ملک کے کسی گوشے میں حقیقی تصوف کی کوئی شمع کا فوری روشن ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ مٹی کے تیل سے جلنے والے یہ سینکڑوں دیئے ٹمٹماتے ہوئے دیئے کس عجلت کے ساتھ اپنے پروانوں سے محروم ہوتے ہیں اس موقعہ پر بنی خثعم کے ایک شاعر کا یہ شعر کیا مناسب ہے۔

خلت الدیار فسدتُ غیر مسود ومن الشقاء تفردی بالسود دد

(یعنی شہر کے شہر خالی ہوئے پس میں کسی کے بنائے بغیر سردار بن گیا، یہ بلا مقابلہ سرداری کا ملنا یقیناً بڑی بدنصیبی کی علامت ہے۔)

حاضرینِ کرام! مجھے احساس ہے کہ میں آپ کی کافی سے زیادہ سمع خراشی کر چکا ہوں۔ تاہم اپنی آخری بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ تصوف کے بغیر ایک عالم منفرد آدمی اور ایک جماعتی رہنما کی زندگی میں کیا خلا واقع ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ملت کی دو ایسی مقتدر شخصیتوں کے حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں جن میں سے ایک کے بارے میں زبان سے بے ساختہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے کے بارے میں "مدظلہ العالی" کی دعا نکلتی ہے۔ پہلی شخصیت امام دار الہجرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اور دوسری شخصیت دورِ حاضر کے سب سے بڑے عالم باعمل اور اسلامی دنیا کے مانے ہوئے نمائندہ و ترجمان مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ہے

امام مالکؒ فرماتے ہیں،

"من تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن تصوف ولم يتفقه فقد تزندق ومن جمع بينهما فقد تحقق"

اس قول کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ جس نے ظاہری فقہ کو سیکھا اور تصوف سے کوئی سروکار نہ رکھا تو نتیجتاً فسق کا شکار ہوا۔ بلاشبہ جس کی زندگی تصوف سے خالی ہے اس کو خدا تعالےٰ کا وہ زندہ تعلق ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جو اس کے شب و روز کے سارے آنات و لمحات کو "یادِ الہیٰ" سے مملو رکھے۔ جس کی وجہ سے اس کا تصلب برقرار رہے بلکہ اکثر و بیشتر ہوتا یہی ہے کہ نفسِ امارہ کی طغیانیاں کبھی تو اس کے حریم تدین کے فقط اطراف و جوانب کو بہا لے جاتی ہیں اور کبھی اس کے تمام دیواروں کو ہلا ڈالتی ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی استقامت کا پندار برابر قائم رہتا ہے۔ اور مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں۔

" انسانی زندگی کا طویل ترین تجربہ ہے کہ محض معلومات وتحقیقات اور مجرّد قوانین وضوابط اور صرف نظم ونسق، سرفروشی وجانبازی بلکہ سہل تر ایثار وقربانی کی طاقت وآمادگی پیدا کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے اسکے لیے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقتور تعلق اور ایک ایسی روحانی لالچ اور غیر مادی فائدے کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی بارِ دوش معلوم ہونے لگے

اس لیے کم سے کم اسلام کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ تحریک کے سرے پر ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس نے اپنے حلقہ مجاہدین میں یقین ومحبّت کی روح پھونک دی تھی اور اپنے یقین ومحبّت کو سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں تک منتقل کر کے ان کے لیے تن آسانی اور راحت طلبی کی زندگی دشوار اور جانبازی اور شہادت کی موت آسان اور خوشگوار بنادی تھی۔ اور ان کے لیے جینا اتنا ہی مشکل ہوگیا تھا جتنا دوسروں کے لیے مرنا مشکل تھا۔"

چند سطر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

" معمولی اور معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کرنے والے، فتح ونصرت کی حالت میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں اسکے لیے کسی غیر معمولی یقین وشخصیّت کی ضرورت نہیں لیکن مایوس کن حالات اور قومی احتضار کی کیفیات میں صرف وہی مردِ میدان حالات سے کشمکش کی طاقت رکھتے ہیں جو اپنے خصوصی تعلق باللہ اور قوتِ ایمانی وروحانی کی وجہ سے خاص یقین وکیفیّتِ عشق کے مالک ہوں۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تاریک وقفے آئے کہ ظاہری علم وحواس اور قوتِ مقابلہ نے جواب دے دیا۔ اور حالات کی تبدیلی امرِ محال معلوم ہونے لگی۔ تو کوئی صاحبِ یقین وصاحبِ عشق میدان میں آیا جس نے اپنی " جرأتِ رندانہ " اور " کیفیتِ عاشقانہ " سے زمانے کا بہتا ہوا دھارا بدل دیا اور اللہ تعالیٰ نے " یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ " اور " یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا " کا منظر دکھایا۔

حضرات! اس طویل اقتباس کو نقل کرنے اور سنانے کی زحمت اس لیے گوارا کی گئی کہ اس میں ایک رہنما کے لیے تصوّف اور قوتِ روحانی کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے مولانا نے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ رہنمائے جماعت کے لیے ایمانی وروحانی کیفیات کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ کہیں ابتلا وآزمائش کی سخت گھڑیوں میں عزیمت کی

مشکل پسندیوں اور مہم جوئیوں سے منہ موڑ کر رخصت کی تن آسانیوں پر قانع نہ ہو جانے اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی خلوص و للّٰہیت جذب و کشش اور حوصلہ و ہمت سے جماعت کی شیرازہ بندی قائم رہے نہیں تو رہنما کی رخصت پسندی اور جماعتی انتشار میں سے کسی ایک کا وجود بھی جماعتی مقاصد کو ناممکن الحصول بنا دیگا۔

آخیر میں ایک وضاحت یہ بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ صوفیانہ صفات اور روحانی کیفیات کا عالم ہونا اور بات ہے اور اس کا حامل ہونا بالکل الگ بات ہے۔ اخلاقی قدروں پر محققانہ تقریر کرنے سے آدمی متخلق ہرگز نہیں بنتا، اس سلسلے میں ہمارے ایک استاد مرحوم ایک حکایت بیان فرمایا کرتے تھے کہ غالباً ابوالبرکات بغدادی سے کسی نے ابوعلی سینا کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کیسے آدمی ہے انہوں نے جواب دیا کہ "اخلاق ندارد"۔ کسی نے ابوعلی سینا کو یہ بات پہنچائی تو انہوں نے اخلاق کے موضوع پر ایک مفصّل و مبسوط کتاب تصنیف کی جس میں للّٰہیت، صبر و رضا، اعتماد و توکّل، ریا و نمود خود بینی و خود ستائی، کینہ و حسد جیسے بے شمار اخلاقی فضائل و رزائل پر بڑی باریک بینی سے بحث کی گئی تھی اور پھر اس کتاب کو ابوالبرکات بغدادیؒ کے پاس بھیجا، آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ میں نے کب کہا تھا کہ "اخلاق ندانند" میں نے تو کہا تھا "اخلاق ندارد" تو تصوّف کے ضمن میں جس چیز کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے وہ اس کا درجہ حال حاصل کرنا ہے نہ کہ فقط قال۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

قارئین متوجہ ہوں!

حکمتِ قرآن کے بعض مستقل خریداروں کی شکایت کے پیش نظر ادارے نے طے کیا ہے کہ آئندہ سے چندہ ختم ہو جانے کی اطلاع پیشگی طور پر دو ماہ قبل دے دی جایا کرے گی۔ تاکہ جو حضرات منی آرڈر بھیجنا چاہیں وہ بروقت منی آرڈر ہمیں ارسال کر دیں۔ اور اس طرح یہ تکلیف دہ صورت نہ پیش آئے کہ آپ کی جانب سے منی آرڈر بھیجا جا چکا ہو لیکن بروقت نہ پہنچنے کی وجہ سے ہم یہاں سے رسالہ وی پی بھیج دیں (ادارہ)

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام (۱۴)

مزارعت اور عقلی و قیاسی دلائل

از قلم: مولانا محمد طاسین

مزارعت کے جواز اور عدم جواز سے متعلق قرآن و حدیث کے سمعی و نقلی دلائل کے بعد اب میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ وہ عقلی اور قیاسی دلائل بھی پیش کر دوں جو مزارعت کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں فریقین کی طرف سے پیش کئے گئے ہیں۔

جو حضرات مزارعت کو جائز کہتے ہیں ان کی طرف سے ایک قیاسی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مزارعت، مضاربت کی طرح ہے۔ مضاربت جائز ہے تو مزارعت بھی جائز ہونی چاہیئے۔

اس کا جواب مزارعت کو ناجائز کہنے والوں کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ مزارعت کو مضاربت پر قیاس کرنا کئی وجوہ سے فاسد اور غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ اصول فقہ کی کتابوں میں صحت قیاس کے لئے جو شروط لکھی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ کہ مقیس غیر منصوص اور مقیس علیہ منصوص ہونا چاہیئے یعنی جس مسئلے اور معاملے کو دوسرے پر قیاس کیا جا رہا ہے قرآن و حدیث میں اس کا واضح ذکر اور صریح حکم موجود نہ ہو، جبکہ مقیس علیہ یعنی جس پر قیاس کیا جا رہا ہے اس کا قرآن و حدیث کی کسی نص میں صراحت کے ساتھ ذکر اور واضح حکم مذکور ہو۔ اور یہاں مقیس یعنی مزارعت کا حدیث میں نہایت واضح الفاظ میں ذکر اور حکم موجود ہے۔ لہٰذا قیاس کی سرے سے کوئی ضرورت اور گنجائش ہی نہیں اور پھر جس مقیس علیہ یعنی مضاربت پر مزارعت کو قیاس کیا گیا ہے وہ منصوص نہیں یعنی نہ قرآن مجید میں اس کا ذکر اور حکم ہے اور نہ کسی صحیح مرفوع حدیث میں اس کے جواز کی کوئی صراحت ہے۔ سنن ابی داؤد میں باب المضارب کے تحت جو دو حدیثیں بیان کی گئی ہیں دونوں کا فقہی مضاربت سے کچھ تعلق نہیں اور سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہیں۔ اسی طرح کتاب سنن ابن ماجہ میں حضرت صہیب کے حوالے سے باب المضاربہ میں جو حدیث ہے وہ بھی حد درجہ ضعیف ہے۔ اسی طرح سنن الکبریٰ بیہقی میں حضرت عباسؓ کے حوالے سے جو حدیث ہے اسے خود امام بیہقی نے ضعیف لکھا اور اس کے ضعف کی وجہ اس کی سند میں ابو الجارود نامی پرلے درجے کے جھوٹے راوی

کا موجود ہونا بتلائی ہے۔ غرضیکہ کتب حدیث میں کوئی صحیح اور مرفوع حدیث ایسی نہیں ملتی جس میں صراحت کے ساتھ جوازِ مضاربت کا بیان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابن رشد اور ابن حزم وغیرہ نے دعوے کے ساتھ لکھا ہے کہ مضاربت کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی نص موجود نہیں دیکھئے مقدمات ابن رشد اور مراتب الاجماع لابن حزم۔ پھر جب مضاربت منصوص ہی نہیں تو اس پر مزارعت کو جو منصوص ہے کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو سرے سے اصول قیاس ہی کے خلاف ہے۔

دوسری وجہ اس قیاس کے صحیح نہ ہونے کی یہ کہ غور سے دیکھا جائے تو مزارعت اپنی ماہیت کے لحاظ سے مضاربت کے مشابہ ومماثل ہی نہیں بلکہ ان کے درمیان بعض بنیادی فروق ہیں مثلاً ایک یہ کہ مزارعت میں صاحب زمین کی زمین ہر حال میں اپنی حالت پر برقرار رہتی ہے۔ کاشت کرنے سے نہ اس کی قیمت گھٹتی اور نہ مالیت کم ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ جب کاشت کار اس میں خوب محنت کرتا اور کھاد وغیرہ دیتا ہے تو اس کی حالت پہلے سے بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ بہر حال کاشت کاری سے اس میں کسی نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ جبکہ مضاربت میں رب المال کا مال اپنی حالت پر برقرار نہیں رہتا۔ تجارت سے اس میں ردّ وبدل ہوتا اور بعض دفعہ خاص حالات کیوجہ سے اصل مال میں بھی گھاٹا اور خسارہ واقع ہو جاتا ہے گویا مضاربت کے اصل مال میں گھاٹے اور خسارے کا اندیشہ رہتا ہے۔ دوسرا فرق یہ کہ جو لوگ جواز مزارعت کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس میں مدت کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مدت کے اندر کوئی فریق مزارعت کے معاملہ کو ختم نہیں کرسکتا بخلاف مضاربت کے کہ اس میں مدت کا تعین نہیں ہوتا لہٰذا ہر فریق جب چاہے اسے ختم کرسکتا ہے۔ تیسرا فرق یہ کہ مضاربت میں مال والے فریق یعنی رب المال کی طرف سے کام کرنے والے فریق یعنی مضارب کے لئے ایک ایثار موجود ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر تجارت میں بجائے نفع کے الٹا نقصان ہو گیا جو بعض دفعہ ہو جایا کرتا ہے تو وہ نقصان سارے کا سارا مال والا فریق برداشت کرے گا۔ کام کرنے والا اس نقصان میں شریک نہ ہوگا جبکہ مزارعت میں زمین والے فریق کی طرف سے کاشت کار کے لئے ایسا کوئی ایثار موجود نہیں ہوتا اور غالباً یہی ایثار مضاربت کے جواز کا سبب ہے، چوتھا فرق یہ کہ مضاربت میں مال تمام تر ایک فریق کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر کام کرنے والا یعنی مضارب اپنا بھی کچھ مال اس میں شامل کرے تو مضاربت کا معاملہ فاسد ہو جاتا ہے۔ جبکہ ان حضرات کے نزدیک جو مزارعت کو جائز مانتے اور کہتے ہیں کاشت کار کی طرف سے بیج کھاد اور بیل وغیرہ کی شکل میں سرمائے کی شرکت وشمولیت سے مزارعت کا معاملہ فاسد نہیں ہوتا، نتیجہ یہ کہ

جب مضاربت اور مزارعت کے مابین اتنے فرق و اختلاف موجود ہیں تو پھر ایک کو دوسرے پر کیسے قیاس کیا جاسکتا اور ایسا قیاس کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

امام شافعی نے کتاب الآم میں اس قیاس کے فاسد اور غلط ہونے کی دو وجوہ اور بھی لکھی ہیں صفحہ ایکسو۲۰ دو جلد سات پر امام موصوف کی جو عربی عبارت ہے اس کا مطلب اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

پہلی وجہ یہ کہ اس میں ادنیٰ کو اعلیٰ پر نہیں بلکہ اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کیا گیا ہے جو فقہائے کے نزدیک درست نہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت شدہ چیز کو اس چیز پر قیاس کیا گیا ہے جو کسی صحابی کے قول و عمل سے ثابت ہے۔ مزارعت کا عدم جواز رسول اللہ صلعم کی صحیح حدیث سے ثابت ہے جبکہ مضاربت کا جواز آثار صحابہؓ سے ثابت ہے۔ لہٰذا مزارعت کو مضاربت پر قیاس کر کے جائز ثابت کرنا، اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کرنا ہے جو اصولاً اور عقلاً غلط ہے کیونکہ اس سے اعلیٰ، ادنیٰ کے تابع ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ صحابہ کرام کے بعض آثار سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مضاربت کا جواز مساقات پر قیاس کی وجہ سے ہے گویا مضاربت کا جواز خود قیاس سے ثابت ہے مضاربت مقیس اور مساقات مقیس علیہ ہے۔ لہٰذا اگر مزارعت کا جواز قیاس سے ثابت کیا جائے تو پھر جس مساقات پر مضاربت کو قیاس کیا گیا ہے اسی پر مزارعت کو بھی کیوں نہ قیاس کیا جائے لیکن چونکہ مزارعت اور مساقات کے درمیان بنیادی فرق ہے لہٰذا اس کو مساقات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اور پھر قیاس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جبکہ صحیح اور مرفوع احادیث سے مزارعت کا عدم جواز ثابت ہے۔

علامہ ابوجعفر الطحاوی نے بھی شرح معانی الآثار ص ۲۸۲۔ج ۲ میں مزارعت اور مساقات کے مضاربت پر قیاس کی نفی کی اور اس کی دو وجہیں بیان فرمائیں۔ پہلی وجہ یہ کہ مساقات اور مضاربت کے درمیان اس پہلو سے فرق اور اختلاف ہے کہ مضاربت میں منافع کی تقسیم اس وقت درست ہوتی ہے جب اصل سرمایہ محفوظ ہوتا اور رب المال کو واپس مل جاتا ہے۔ لیکن مساقات میں پھلوں کی تقسیم اس کے بغیر بھی درست ہوتی ہے انہوں نے اس کی صورت یہ لکھی ہے کہ ایک باغ میں پھل آگیا اور توڑ لیا گیا۔ پھر قبل اس کے کہ پھل باغ کے مالک اور مساقی کے درمیان تقسیم ہوتا اچانک آگ سے باغ کے درخت جل گئے لیکن توڑا ہوا پھل محفوظ رہا۔ تو اس صورت میں وہ محفوظ پھل مالک باغ اور مساقی کے

کے مابین اس معاہدے کے مطابق ضرور تقسیم ہوتا ہے۔ حالانکہ باغ اس وقت اس شکل سے موجود نہیں ہوتا جس شکل میں مساقی کو دیا گیا تھا۔

دوسری وجہ دونوں کے درمیان فرق و اختلاف کی یہ لکھی ہے کہ مضاربت میں وقت اور مدت کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ چنانچہ فریقین جب چاہیں اسے ختم کر سکتے ہیں بخلاف مزارعت و مساقات کے کہ ان میں وقت و مدت کا تعین لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مدت کے اندر کوئی فریق مزارعت و مساقات کو ختم نہیں کر سکتا بنا بریں مزارعت و مساقات کے جواز کو مضاربت کے جواز پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق اور غلط قیاس ہے۔

ھدائے کی بعض شروح میں بھی مزارعت کو مضاربت پر قیاس کرنے کی تغلیط و تردید کی گئی ہے۔ تکملہ فتح القدیر میں اس قیاس کے صحیح نہ ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ شرائط صحت کے لحاظ سے یہ دو معاملے ایک دوسرے سے جدا اور الگ الگ معاملے ہیں۔ مثلاً صحت مضاربت کے لئے یہ شرط اور ضروری ہے کہ مال اور عمل دونوں ایک فریق کی طرف سے نہ ہوں بلکہ ایک کی طرف سے صرف مال اور دوسرے کی طرف سے صرف عمل ہو۔ چنانچہ اگر رب المال کی طرف سے کچھ عمل یا عامل مضارب کی طرف سے کچھ مال بھی شریک ہو جائے تو معاملہ مضاربت فاسد ہو جاتا ہے جبکہ مزارعت کو جائز کہنے والوں کے نزدیک صحت مزارعت کے لئے یہ شرط نہیں۔ اس میں سرمایہ تمام تر ایک کی طرف سے اور عمل تمام تر دوسرے کی طرف سے ہو۔ چنانچہ وہ مزارعت کی اس شکل کو صحیح مانتے ہیں جس میں کاشت کار کی طرف سے کام و عمل کے ساتھ بیج اور بیلوں وغیرہ کی شکل میں سرمایہ بھی موجود ہوتا ہے (ص ۲۳ - ج ۸ تکملہ فتح القدیر)۔ اسی مقام پر حاشیہ میں العنایۃ شرح الھدایہ کی ایک عبارت اس طرح ہے۔

ولم یذکر الجواب عن القیاس	صاحب ہدایہ نے مزارعت کو مضاربت
علی المضاربۃ لظھور فسادہ	پر قیاس کرنے کا جواب نہیں دیا۔
فان من شرطہ ان یتعدی	اس لئے کہ اس میں قیاس کا فاسد
الحکم الشرعی الی فرع ھو	ہونا بالکل ظاہر ہے، کیونکہ قیاس کی
نظیرہ وھھنا لیس کذلک	صحت کے لئے یہ شرط ہے کہ اصل کا
لان معنی الاجارۃ فیھا اغلب	جو حکم شرعی ہے وہ ایسی فرع پر لگایا

حتی اشترطت فیھا المـــدة
بخلاف المضاربة
(ص ۴۲ ج ۸ تکملہ فتح القدیر)

جیسے دونوں کے مشابہ ہو اور یہاں
فرع ... مزارعت اصل یعنی مضاربت
کے مشابہ نہیں کیونکہ مزارعت میں اجارے
کے معنی غالب ہیں ۔لہٰذا اس میں مدت کا تعین شرط ہے جبکہ اس کے برخلاف
مضاربت میں مدت کا تعین شرط نہیں ۔

مذکورہ بالا عبارات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مزارعت کو مضاربت پر قیاس کرنا کئی وجوہ سے درست نہیں اور بعض پہلی کے فقہاء نے اس قیاس کو فاسد اور غلط بتلایا ہے ۔

مزارعت اور اجارہ

دوسری قیاسی دلیل جو مزارعت کے جواز میں پیش کی جاتی ہے یہ کہ مزارعت اجارے کی طرح کا ایک معاملہ ہے فقہاء کرام کے نزدیک جب اجارہ جائز ہے تو از روئے قیاس مزارعت بھی جائز ہونی چاہیئے ،اس کی کچھ تفصیل یہ کہ جب یہ جائز ہے کہ ایک شخص اپنا مکان فرنیچر اور سواری کا جانور دوسرے کو استعمال و استفادے کے لیئے دے کر اس کے عوض اس سے بطور کرایہ کچھ نقد وغیرہ وصول کرے تو پھر یہ کیوں نہ جائز ہو کہ ایک شخص اپنی مزروعہ زمین دوسرے کو استعمال و کاشت کے لیئے دے کر اس کے عوض اس سے پیداوار زمین وغیرہ کی شکل میں کچھ وصول کرے ۔جب یہ دو معاملے صورت شکل میں ایک طرح کے ہیں تو جواز و عدم جواز کے لحاظ سے ان کا شرعی حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیئے ۔مطلب یہ کہ اجارہ جائز ہے تو مزارعت بھی جائز ہونی چاہیئے ۔

اس دلیل کا جواب مزارعت کو ناجائز کہنے والوں کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ اجارے کا جواز خود خلاف قیاس ہے کیونکہ اس میں جس منفعت پر معاملہ ہوتا ہے وہ بالفعل موجود نہیں ہوتی گویا اس میں بالفعل معدوم شے کی خرید و فروخت ہوتی ہے جس کی بعض احادیث میں صریح ممانعت ہے ۔اور یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز خود خلاف قیاس ہو اس پر دوسری چیز کو قیاس نہیں کیا جاسکتا لہٰذا اجارے پر مزارعت کا قیاس اصولاً صحیح نہیں ۔

دوسرا جواب یہ کہ صحت قیاس کے لئے ضروری ہے کہ مقیس علیہ جس پر قیاس کیا جارہا ہے۔ منصوص ہو یعنی قرآن و حدیث کی کسی نص میں اس کے متعلق واضح حکم ہو، اور چونکہ مادی اور بے جان اشیاء کے اجارہ کے متعلق نہ قرآن مجید کی کسی آیت میں واضح ذکر اور جواز کا صریح ثبوت ہے اور نہ کسی ایسی حدیث نبوی میں جس کی صحت اور حجیت متفق علیہ ہو، قرآن و حدیث میں جس اجارے کے جواز کا صریح طور پر ذکر ہے وہ اجرت پر کام محنت کرنے کرانے کا اجارہ ہے۔ اجارے کے اس قسم کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں کیونکہ متعدد آیات و احادیث میں واضح طور پر اس کے جواز کا ذکر اور ثبوت ہے۔ لیکن کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی منفعت بخش مادی اور بے جان چیز دوسرے کو استعمال و استفادے کے لئے دینا اور اس کے بدلے دوسرے سے بطور کرایہ نقد وغیرہ لینا جائز ہے۔ صرف ایک حدیث اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے جس میں زمین کو سونے چاندی یعنی دینار و دراہم کے بدلے کرائے پر دینے لینے کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس حدیث کے متعلق محدثین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو سرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مانتے ہی نہیں بلکہ راوی صحابی کے الفاظ کہتے ہیں، اس لئے بھی کہ دوسری متعدد احادیث میں جو محدثین کے نزدیک صحیح ہیں اس کراء الارض کی بھی ممانعت ہے جو سونے چاندی یعنی نقد کے عوض ہو، یہی وجہ ہے کہ تابعین میں سے بعض حضرات جیسے طاؤس بن کیسان اس کراء الارض کا سختی کے ساتھ انکار کرتے تھے، علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب المحلی میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور کراء الارض بالذہب والفضہ کے جواز والی حدیث کو ناقابل استدلال ٹھہرایا۔ اور نقد کے عوض کراء الارض کو ناجائز بتلایا ہے۔ حالانکہ وہ پیداوار کے ایک حصے پر مزارعت کے جواز کے قائل ہیں۔

پھر اگر حدیث مذکور کو صحیح مان کر باقی مادی بے جان چیزوں کے اجارہ کے جواز کی دلیل تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مکان، فرنیچر اور گاڑی وغیرہ بے جان چیزوں کے اجارے کا جواز زمین کے اجارے کے جواز پر قیاس سے ثابت ہے۔ اور چونکہ مزارعت بھی کراء الارض ہی کی ایک شکل ہے۔ لہٰذا دعوٰی کے مطابق بجائے اس کے کہ مزارعت کا جواز باقی چیزوں کے جواز اجارہ پر قیاس سے ثابت کیا جاتا الٹا باقی چیزوں کے جواز اجارہ کو کراء الارض کے جواز پر قیاس سے ثابت کرنا پڑا گویا دعوٰی دلیل بن گیا اور دلیل دعوٰی بن گئی

غرضیکہ مزارعت اور کراء الارض کے جواز کو باقی بے جان مادی چیزوں کے اجارے کے

جواز پر قیاس کرنا، اصول قیاس کے خلاف ہے کیونکہ صحت قیاس کے لئے ضروری ہے کہ جس پر قیاس کیا جائے وہ منصوص اور جس کو قیاس کیا جائے وہ غیر منصوص ہو حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی مزارعت کا عدم جواز متعدد احادیث سے ثابت اور منصوص ہے اور اجارے کا جواز کسی آیت اور صحیح و مستند حدیث سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے غیر منصوص ہے۔

تیسرا جواب یہ کہ اجارے کے جواز کی جو عقلی دلیل ہو سکتی ہے یہ کہ جب کسی مادی منفعت بخش چیز کو کوئی شخص استعمال کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس سے اس چیز کی مالیت اور قدر و قیمت گھٹتی اور کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ استعمال سے وہ برابر گھستی اور تحلیل ہوتی چلی جاتی ہے لہٰذا اس کے استعمال پر اس کا مالک دوسرے سے جو کرایہ لیتا ہے وہ از روئے عقل اور انصاف اس لئے جائز ہوتا ہے کہ دوسرے کے استعمال سے اس چیز کی مالیت اور قدر و قیمت میں کمی واقع ہوئی، گویا کرایہ اس کمی کا عوض ہوتا ہے جو کرایہ دار کے استعمال سے اس شے کی مالیت اور قیمت میں رونما ہوتی ہے، لہٰذا "الخراج بالضمان" کے قاعدہ سے کرایہ کا جواز ثابت ہوتا ہے البتہ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کرایہ اتنا ہی وصول کیا جائے جتنی کہ استعمال سے اس چیز کی مالیت و قیمت میں کمی واقع ہوئی۔

اور اگر استعمال کے لئے دی ہوئی چیز ایسی ہو جو استعمال ہونے سے نہ گھٹتی اور نہ مالیت میں کم ہوتی ہو، استعمال ہونے سے پہلے اس کی جو مالیت اور قدر و قیمت ہو استعمال ہونے کے بعد بھی اس کی وہی مالیت اور قدر و قیمت رہتی ہو، جیسے روپے پیسے اور سکے رائج الوقت، ظاہر ہے کہ محض استعمال ہوتے رہنے سے ان کی مالیت اور قدر و قیمت میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی آپ نے ایک شخص کو مثلاً ایک ہزار روپے استعمال اور فائدہ اٹھانے کے لئے دیئے اور اس نے ایک سال کے بعد وہ جب آپ کو واپس کئے تو عام حالات میں ان کی قدر و قیمت وہی رہتی ہے جو ایک سال قبل تھی محض استعمال ہونے سے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی الا یہ کہ حکومت کسی اجتماعی مصلحت کے تحت سکے کی قیمت گھٹا یا بڑھا دے۔ لہٰذا آپ محض استعمال کے عوض دوسرے سے بطور کرایہ کچھ نہیں لے سکتے کیونکہ اس کرائے میں کوئی مادی عوض موجود نہیں، غور سے دیکھا جائے تو ربوٰ کے حرام ہونے کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس میں مقرض اپنے مقروض سے قرض کی اصل رقم پر جو زائد لیتا ہے چونکہ اس کے بدلے اس کی طرف سے کوئی مادی عوض موجود نہیں ہوتا لہٰذا وہ اپنا حق نہیں بلکہ دوسرے کا حق لیتا ہے۔ جس کا دوسرا نام ظلم ہے۔

اجارے اور کرائے کے جواز اور عدم جواز سے متعلق اوپر جو تفصیل عرض کی گئی ہے اس کی روشنی میں جب ہم زمین کا جائزہ لیتے ہیں تو زمین ان چیزوں میں سے نظر نہیں آتی جو استعمال ہونے سے گھستی، گھٹتی اور قدر و قیمت میں کم ہوتی جاتی ہیں بلکہ ان چیزوں میں نظر آتی ہے جن کے استعمال ہونے سے مالیت اور قدر و قیمت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی اور وہ عام طور پر اپنی حالت پر قائم و برقرار رہتی ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جس زرعی زمین کی قیمت آج مثلاً ایک ہزار روپے فی کنال ہو ایک سال کاشت ہوتے رہنے کے بعد اس کی قیمت گھٹ کر نو سو روپے فی کنال ہو جاتی ہو جبکہ کاشت کار اسے خوب پانی کھاد وغیرہ دے رہا اور پوری محنت سے کاشت کر رہا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس یہ دیکھا گیا ہے کہ بنجر وغیر آباد زمین کی قیمت آباد اور قابل کاشت ہونے سے کچھ بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا زمین کو اجارے کے معاملے میں مکان فرنیچر مشین اور موٹر وغیرہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان چیزوں میں اجارے کے جواز کی جو وجہ اور علت ہے وہ زمین میں نہیں پائی جاتی، بلکہ دیکھا جائے تو زمین زر و نقدی کے مشابہ نظر آتی ہے۔ لہٰذا قرین قیاس یہ ہے کہ زر و نقدی کے اجارہ کی طرح زمین کا اجارہ بھی ناجائز ہونا چاہیئے۔

ایک اور عقلی قسم کی دلیل جو بعض دفعہ مزارعت کے جواز کے لئے پیش کی جاتی ہے یہ کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس زمین ہوتی ہے لیکن وہ اپنے کسی عذر کی بنا پر مثلاً بیمار، بڑھاپے اور کمزوری و بیماری کی وجہ سے اپنی زمین کو خود کاشت نہیں کر سکتا حالانکہ اسے اس کی حاجت و ضرورت ہوتی ہے اور یہ حاجت و ضرورت چونکہ مزارعت کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے لہٰذا تقاضائے عقل یہ ہے کہ مزارعت جائز ہونی چاہیئے۔ بالفاظ دیگر مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ مذکورہ قسم کے لوگوں کے لئے مزارعت جائز ہو تاکہ وہ معاشی پریشانیوں سے محفوظ رہیں۔ اور یہ اس لئے بھی کہ اسلام نے اپنے شرعی احکام میں انسان کی حاجت و ضرورت اور مصلحت و بہبودی کو پوری طرح ملحوظ اور مدنظر رکھا ہے۔ جاری ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

نقد و نظر

مزید اشکالات

بسلسلہ مروجہ نظام زمینداری اور اسلام

——— از قلم محمد اکرم خان

جناب مولانا محمد طاسین صاحب کا مضمون توضیح اشکالات" کے عنوان سے حکمت قرآن (۳:۱) مارچ ۱۹۸۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ جو میرے اُن چند سوالات کے جواب میں ہے جو اُن کے مضمون "مروجہ زمینداری اور اسلام" پر میں نے کئے تھے، یہ سوالات حکمت قرآن کے ستمبر ۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ چونکہ مولانا محمد طاسین صاحب کے جواب سے میرے ذہن میں مزید سوالات پیدا ہوگئے ہیں۔ لہذا مسئلہ کی مزید تنقیح کی خاطر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

میں جناب مولانا محمد طاسین صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے سوالات کا نہایت وضاحت سے جواب تحریر فرمایا۔ اس سے مجھے ان کا نقطہ نظر سمجھنے میں بہت آسانی ہوئی ہے۔

پہلا سوال افراط زر اور سود سے متعلق ہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں، زر کاغذی یعنی نوٹ حقیقی طور پر اور بذات خود مال نہیں بلکہ تبادلۂ مال کا ذریعہ تسلیم کر لینے کی وجہ سے مجازی طور پر مال ہیں۔ دنیا میں افراطِ زر کا اصل سبب کاغذی کرنسی کا رواج ہے اس کے ختم ہوتے بغیر انسانیت کو افراطِ زر کی مصیبت سے چھٹکارا ملنا مشکل ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک بارٹر سسٹم کے تحت اجناس کا تبادلہ اجناس سے ہوتا تھا یا جب تک رائج الوقت سکے سونے چاندی کے ہوتے تھے، کبھی افراطِ زر کا مسئلہ اس طرح پیدا نہیں ہوا....

دوسری طرف بعض ایسی مشینوں کی ایجاد نے کچھ لوگوں کے لئے جعلی کرنسی چھاپنے کا موقع فراہم کر دیا ہے جو کہ اصل کی ہو بہو کاپی کرتی ہیں حتیٰ کہ اصل و نقل میں کچھ امتیاز نہیں ہو سکتا، پھر اس میں کچھ اضافہ ان شراکتی کمپنیوں اور بنکوں کے ذریعے بھی ہوا جو اپنی مالی حیثیت سے زیادہ کاغذی شیئرز اور سندات جاری کرتے ہیں۔ (صفحہ ۶)

اول یہ بات کہ زرِ کاغذی حقیقی مال نہیں ہے ایک پرانی رائے ہے جو اس زمانے میں قائم کی گئی تھی جب زرِ کاغذی کا آغاز ہوا تھا۔ اب آہستہ آہستہ زرِ کاغذی تمام کاموں میں استعمال ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اس کا کہیں بھی تبادلہ سونا یا چاندی سے نہیں ہو سکتا، لہٰذا عملاً زرِ کاغذی اسی طرح

سے مال ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا مال۔ یہی وجہ ہے کہ زر کاغذی پر زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔ اگر یہ مال حقیقی معنوں میں نہیں تو پھر اس پر زکوٰۃ بھی عائد نہیں ہونا چاہیئے۔ حالانکہ یہ رائے کسی کی بھی نہیں ہے۔

دوم، یہ رائے کہ افراطِ زر کا علاج زر کاغذی سے دوبارہ دھاتوں کے زر یا بارٹر سسٹم کی طرف پلٹنا ہے محلِ نظر ہے۔ اس کی حمایت میں پوری دنیا میں ایک رائے بھی نہیں ہے نہ کسی تجزیے کے ذریعے سے اسے ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی پوری دنیا میں اس پر کوئی عمل کرنے کو تیار ہوگا، ایسا علاج خواہ اسلام کے نام پر پیش کیا جائے یا منطق کے زور پر، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

سوم، جعلی کرنسی افراطِ زر کا ذریعہ ہے، ایک نئی بات ہے، پوری دنیا میں کس قدر جعلی کرنسی گردش میں ہے، کسی کو معلوم نہیں ہے، لہٰذا اس طرح کی بات ثابت نہیں کی جا سکتی۔

چہارم، شراکتی کمپنیوں اور بنکوں کے کاغذی شیئرز اور سندات" سے مولانا کی کیا مراد ہے، مضمون سے واضح نہیں ہوتا۔ افراطِ زر میں یہ کس طرح ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں، یہ بھی پتہ نہیں چلتا۔ آگے چل کر مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"لہٰذا اسلام کی رو سے اِن (کرنسی نوٹ) کے قرضہ میں اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ بوقت قرضہ اِن نوٹوں سے کوئی حقیقی مال کتنی مقدار میں مل سکتا تھا، جتنی مقدار میں وہ مال مل سکتا تھا، نوٹوں کی تعداد کی بجائے اس کو قرضہ متصور کیا جائے اور پھر ادائیگی اس کے مطابق ہو۔ مثلاً زید نے بکر کو سو روپے کے کرنسی نوٹ ایک سال کے لئے بطور قرض دیئے جب کہ دیتے وقت ان کے عوض بازار میں ایک من غلہ مل سکتا تھا تو اس صورت میں نوٹوں کی بجائے ایک من غلہ کو قرض تصور کیا جائے گویا بکر نے زید سے ایک من غلہ ایک سال کے لئے قرض لیا۔ لہٰذا ایک سال کے بعد بکر پر لازم ہوگا کہ وہ زید کو اتنی رقم ادا کرے جتنی اس وقت ایک من گندم یا چاول کے برابر ہو۔ (صفحہ ۹)

اس سلسلے میں درج ذیل باتیں قابلِ غور ہیں۔

اوّل، یہ بات متنازع فیہ شکل اختیار کر سکتی ہے کہ کسی وقت حقیقی مال کیا ہو، بیسیوں اشیاء میں سے کس چیز کو آپ معیار کے طور پر اختیار کریں گے۔ اور جس چیز کو اختیار کریں گے اس کی شرعیت سے کون سی سند لائیں گے؟

دوم، اس وقت دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی اپنی قدر و قیمت یکساں رہتی ہو، حتیٰ کہ سونا بھی روز گھٹتا بڑھتا ہے۔ پھر ایسی چیز جو خود یکساں قدر و قیمت کی مالک نہ ہو، مذکورہ بالا صورت میں قدر و قیمت کا معیار کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟

سوم، اور یہ سب سے اہم بات ہے کہ جناب مولانا طاسین صاحب نے اپنے مذکورہ حل میں یہ طے

کر دیا ہے کہ روپے کے بدلے روپے کے ادھار تبادلے کی صورت میں قدر و قیمت (QUALITY) کا اعتبار کیا جائے گا۔ یعنی اگر قدر و قیمت میں فرق آجائے تو تبادلہ برابر سرابر نہ ہوگا بلکہ اصل قدر و قیمت کے مطابق طے پائے گا، حالانکہ یہی وہ بات ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً ربا الفضل کہہ کر حرام قرار دیا ہے۔ وہ مشہور حدیث جس میں ایک صحابیؓ تین صاع گھٹیا کھجوروں کے بدلے میں دو صاع عمدہ کھجوریں لے آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ربا الفضل قرار دیا اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اشیاء کے تبادلے میں اگر وہ ایک ہی جنس کی ہوں قدر و قیمت (QUALITY) کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ کمیت (QUANTITY) کا اعتبار ہوگا۔ جناب مولانا محمد طاسین صاحب کے مذکورہ بالا حل میں روپے کے تبادلے میں اصل اعتبار قدر و قیمت (QUALITY) کا ہے جو اس کو صراحتاً ربوا الفضل کا معاملہ بنا دیتا ہے۔

دوسرا سوال

مزارعت میں زمین کی پیداواری صلاحیتوں کے معاوضے کا سوال ہے۔ اس پر موصوف تحریر فرماتے ہیں "یہ زمین میں جو پیداواری صلاحیت ہوتی ہے، وہ قدرتی اسباب و عوامل کے زیر اثر وجود میں آتی ہے اور ایک خالص قدرتی چیز ہوتی ہے اور وہ اس شخص کے لئے قدرت کا مفت عطیہ ہوتی ہے جو زمین کو کاشت کرتا ہے۔" (صفحہ ۶۱)

یہ ایک دلچسپ اندازِ بحث ہے، اگر زمین کی پیداواری صلاحیتیں قدرت کا عطیہ ہیں تو انسانی پیداواری صلاحیتوں کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے؟ کیا انسان ان کا مالک و خالق ہے؟ جس منطق کی رو سے موخر الذکر کا معاوضہ جائز ہے اس کی رُو سے اوّل الذکر کا ہونا چاہیئے۔ مولانا کے پاس ان میں فرق کرنے کے کون سے عقلی دلائل ہیں؟

تیسرا سوال

صرف محنت کے عامل پیدا کش ہونے کے بارے میں ہے، یہ بحث معاشیات کی کتابوں میں بہت تفصیل سے موجود ہے کہ سرمایہ عامل پیدا کش ہے یا نہیں، سرمایہ دارانہ معیشت اور اشتراکی معیشت کے علمبرداروں نے اپنی اپنی طرف سے بہت دلائل دیئے ہیں اور معاملہ کسی طرح سے بھی فیصلہ کن شکل اختیار نہیں کر سکا۔ البتہ ہم اس فریم ورک میں رہتے ہوئے جو خود جناب محمد طاسین صاحب نے اپنے لئے مہیا کیا ہے درج ذیل معروضات پیش کرتے ہیں:

اوّل، مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سرمایہ اصل میں ماضی کی محنت ہی ہے (صفحہ ۶۶) جو کہ سرمایہ کی شکل میں جمع ہو گئی ہے، اس صورت میں سرمائے کا معاوضہ نہ ہونا عقل کے خلاف ہے۔ کیونکہ سرمایہ کچھ نہیں ہے سوائے جمع شدہ محنت کے اور محنت کے معاوضہ کے مولانا خود قائل ہیں، لہٰذا سرمائے کے معاوضے کی مخالفت سمجھ میں نہیں آتی۔

دوم، مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ و محنت کی تمام کش مکش اس وجہ سے

ہے کہ فریقین کا حصہ طے کرنے کا کوئی دائمی اور عادلانہ فارمولا نظام میں نہیں ہے۔ اب اسلامی نظام کو لیجئے۔ فرض کیجئے ایک شخص اپنے سرمائے اور محنت سے کاروبار کر رہا ہے، وہ اپنے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کر لیتا ہے جو صرف محنت کر سکتا ہے اور اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے فرض کیجئے دونوں ایک ہی صلاحیت کے انسان ہیں اور یکساں اوقات کام کرتے ہیں، اسلامی نظام میں ان کے درمیان منافع کی تقسیم کیسے ہوگی؟ ایک صورت یہ ہے کہ دوسرا شخص ملازم ہو۔ اس صورت میں بھی چونکہ پہلا شخص اور دوسرا شخص برابر کی محنت کر رہے ہیں، مولانا کے انصاف کی رُو سے دونوں کو برابر برابر حصہ ملنا چاہیئے (چونکہ سرمایہ تو عامل پیدائش ہی نہیں ہے) زیادہ سے زیادہ پہلا شخص سرمائے کی فرسودگی مزید لے سکتا ہے، کیا مولانا کے نزدیک یہی صورت تقسیم منافع کی ہوگی یا کوئی دوسری؟ اور اگر یہی ہوگی تو کسی بھی غیر جانب دار معقول آدمی سے پوچھ لیں کہ کیا یہ انصاف ہوگا؟ شریعت کے معیار کی بات تو بہت دور کی ہے، عقل سلیم بھی اسے تسلیم نہیں کرے گی، علاوہ ازیں خود معاشی قوتیں اتنی مضبوط اور طاقت ور ہیں کہ وہ اس طرح کے "انصاف" کو ہوا میں تحلیل کر دیں گی، کوئی شخص بھی اپنے سرمائے اور محنت کے ساتھ صرف محنت کرنے والے کو برابر کا شریک نہیں ٹھہرائے گا، تب محنت کرنے والے کہاں کام کریں گے؟ سرمایہ کہاں سے فراہم ہوگا؟ خود مولانا تسلیم کرتے ہیں کہ اس نظریہ کے سب سے بڑے علمبردار اشتراکی ممالک بھی اس پر عمل نہ کر سکے، یہی نہیں، اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں سے کسی دور، کسی ملک (بشمول خلفائے راشدین) میں دکھا دیجئے کہ کہاں یہ بات رائج رہی ہے کہ معاوضہ کا حق صرف محنت کو رہا ہو؟ یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے، اگر علامہ ابن خلدون یا کسی دوسرے مفکر نے ماضی میں بھی یہ رائے رکھی ہے تو اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا عمل کب اس پر ہوا ہے؟ اس کے کیا امکانات ہیں کہ اس پر آئندہ بھی عمل ہو سکے۔

صرف محنت کو معاوضے کا حق دلا کر ہم بہت سی اور پیچیدگیوں کا دروازہ بھی کھولتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں حکومتوں اور کاروباروں کے لئے سرمائے کا ایک بڑا حصہ گھریلو بچتوں (House hold savings) کی شکل میں میسر آتا ہے۔ اگر ان بچتوں کو مفید طور پر استعمال کرنے کا محرک چھین لیا جائے تو کون اپنا سرمایہ کاروباروں اور حکومتوں کو دے گا؟ شریعت کی کوئی ایسی تعبیر جس سے آپ انسانیت کو مفید کاموں سے محروم کر دیں کسی دور میں بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ ان بچتوں پر شریعت نے سود کو حرام قرار دیا ہے، لیکن اس سے بڑھ کر اسے مضاربت و شراکت کی بنیادوں پر لگانے پر بھی پابندی لگا دی جائے تو اس سے خواہ مخواہ شریعت کا قافیہ تنگ ہو جائے گا۔ یہ فقہی بحث کہ شرکت کے لئے محنت لازم اور مضاربت ایک مشتبہ شکل ہے، اس عظیم منفعت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے جو انسانیت کو اس سرمائے کے استعمال سے پہنچ سکتی ہے۔

یہی نہیں، اگر آپ لوگوں کو مضاربت پر سرمایہ لگانے سے روکتے ہیں کیونکہ آپ کے نزدیک یہ فی الاصل مباح نہیں بلکہ مشتبہ ہے، تو آپ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو جو حلال ذرائع سے روپیہ کما کر کچھ بچا لیتی ہے اور پھر مضاربت کے ذریعہ اس میں اضافہ کر لیتی ہے اس آسانی سے محروم کرتے ہیں۔ اس طرح سے بیوہ عورتیں اور یتیم بچے جو خود کما نہیں سکتے، شریعت کی اس اجازت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی مثالی معاشرے میں بیواؤں اور یتیموں کی نگہداشت حکومت کرتی ہے لہٰذا انھیں مضاربت کی ضرورت نہیں تو یہ ایک کم تر درجے کا اہتمام ہے۔ کیونکہ آپ لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے روک کر حکومت کی مشینری کا محتاج رکھنے کا حل بتا رہے ہیں، اور ساری دنیا گواہ ہے کہ یہ ایک غیر مستند (INEFFICIENT) حل ہے۔

اس سے اگلی بات یہ ہے کہ شریعت نے وراثت میں عورتوں کا حصہ رکھا ہے، اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو دو عورتوں کے برابر ایک مرد کے حصہ کی رُو سے کسی معیشت کی تمام دولت کے ایک تہائی حصہ کی مالک عورتیں قرار پاتی ہیں۔ شریعت کی مروجہ تعبیر کی رُو سے عورتوں کا جو معاشرتی رول ہے وہ انھیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کاروبار کریں اور محنت کر کے کمائیں۔ اس طرح سے وہ ایک تہائی دولت جس کی عورتیں قانوناً مالک ہیں یا تو بے کار رہے یا پھر مضاربت کے ذریعے سے کاروبار میں لگے۔ مضاربت کے خلاف جو بھی فقہی اعتراضات ہوں ان پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ مضاربت کو مشتبہ یا مکروہ قرار دے کر ہم شریعت سے ایک ایسی وسعت کو واپس لے رہے ہیں جو کہ اس دور کے ان گنت مسائل کا حل کر سکتی ہے۔

اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عربوں کے تجارتی قافلے جاتے تھے جن میں مکے کی عورتیں اور بوڑھے مرد پیسہ لگاتے تھے۔ یہ قافلے مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ جمع کرتے تھے اور کاروبار کرتے تھے۔ ویسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مضاربت رائج تھی، تاریخی طور پر اس کا ثبوت موجود ہے (بعد کے ادوار میں بھی یہ موجود رہی ہے اس پر مستشرقین نے بیش قیمت تاریخی شواہد جمع کیے ہیں) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس سے نہیں روکا، اور یہ اصول مسلمہ ہے کہ اگر کسی رائج الوقت عُرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا تو وہ عرف جائز ہے۔

اس دور میں جب کہ سود ہماری زندگی میں خون کی طرح پیوست ہے اور معاشی پیچیدگیاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہیں، ایسے اجتہادات کی ضرورت ہے جو لوگوں کو حلال کے اندر رہتے ہوئے آسانی فراہم کریں نہ کہ ایسا قافیہ تنگ کیا جائے کہ لوگ چاہیں بھی تو شریعت پر عمل نہ کر سکیں۔ جن چیزوں کو شریعت نے حرام نہیں کیا ہم انھیں خود سے حرام کر کر کے لوگوں کی دشواریوں میں اضافہ کئے جا رہے ہیں۔

"قرآنِ عظیم کی زبان"

——— مرسلہ: ڈاکٹر شبیر بہادر خاں پنی

"حکمتِ قرآن" مئی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں مضمون عنوان بالا سے از قلم جناب خورشید صاحب (ہوسٹن - امریکہ) کا پڑھ کر خوشی ہوئی کہ امریکہ کے ایک باسی کے اہلِ قلم سے ایسا فکر انگیز اور پُر از تاثیر مقالہ شائع ہوا۔ یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ ابھی اس مضمون کی مزید قسط آنے والی ہے۔

میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ "قرآن عظیم کی زبان" عربی مبین پر عالمی و عبقری علماء اسلام کی نگارشات کے اقتباسات قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لیے ارسال کروں۔

۱ —— مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور سورۃ الانبیاء کے آخری نوٹ (ترجمان القرآن جلد دوم صفحہ ۴۸۴) پر حضرت ایوبؑ کے زمانہ کی تحقیق کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

"نا ثالثاً معلوم ہوگیا کہ عربی علم و ادب کی تاریخ اس عہد (یعنی حضرت ابراہیم کے عہد) سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے جو عہد عام طور پر سمجھ لیا گیا تھا کیونکہ اگر حضرت موسیٰؑ سے پہلے سِفرِ ایوبؑ جیسی نظم عربی میں لکھی جا سکتی تھی تو یقیناً عبرانی علم و ادب کی نشوونما سے صدہا سال پہلے عربی علم پوری طرح ترقی یافتہ ہو چکا تھا۔ بلا شبہ سِفرِ ایوبؑ کی عربی وہ عربی نہ ہوگی جو نزولِ قرآن کے وقت بولی جاتی تھی۔ یقیناً عربی کی کوئی ابتدائی شکل ہوگی جس کی اخوات، ہمیں آرامی، کلدانی اور آشوری کتبات کے الفاظ و اسماء میں نظر آرہی ہیں۔ اور قدیم مصری بھی اس کی جھلک سے خالی نہیں تاہم وہ عربی زبان ہی ہوگی اور اسی عربی نے موجودہ عربی کے تمام عناصر و مواد بہم پہنچائے ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ عہد جاہلیت کی عربی اگرچہ صحرائیوں کی زبان تھی لیکن زبان کی نوعیت بول رہی ہے کہ یہ صحرائی قبائل کی پروردہ نہیں ہوسکتی۔ اتنی وسیع، اتنی ہمہ گیر، اتنی دقیقہ سنج اس درجہ متمول زبان ضروری ہے کہ صدیوں کی متوارث و مسلسل ادبی زندگی سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ جو زبان قرآن کے معانی و حقائق کی متحمل ہو گئی۔ کیونکر ممکن ہے کہ اسے غیر متمدن قبائل کی ایک بدوی زبان تسلیم کر لیا جائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس عربی میں امرؤ القیس نے اشعار کہے، اس عربی کی لغوی تاریخ اس سے بہت زیادہ قدیم اور بہت زیادہ

متمدن ہونی چاہیئے جتنی اس وقت سمجھی گئی۔

گزشتہ صدی تک عربی کی لغوی تاریخ کا یہ مسئلہ ایک لاینحل مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب اثری تحقیقات کے آخری مواد نے بحث و تعلیل کا ایک نیا میدان پیدا کر دیا ہے اور عربی نسل اور عربی زبان کی تاریخ بالکل ایک نئی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔ یہ زبان جس کی بزرگی و خلود کی آخری مہر قرآن نے لگائی، دراصل نشو و نما کے اتنے مرحلوں سے گزر چکی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی اس وصف میں اس کی شریک نہیں۔ سمیری اور اکادی اقوام کا تمدن، نینوا اور بابل کی علمی کامرانیاں، قدیم مصری لغات کا عمرانی سرمایہ، آرامی زبان کا عروج و احاطہ، کلدانی و سریانی کا ادبی تمول دراصل ایک ہی زبان کی لغوی تشکیل و تکمیل کے مختلف مرحلے تھے۔ اور اس نے آگے چل کر چوتھی صدی قبل مسیح کی عربی کا بھیس اختیار کیا۔ جو زبان حضارۃ و تمدن کی اتنی بھٹیوں میں سے پک کر نکلی ہو ظاہر ہے کہ اس کے اسماء و مصادر کسی مفلس اور خام زبان کے اسماء و مصادر نہیں ہو سکتے۔

علاوہ بریں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا اور جا بجا اس بات پر زور دینا کہ "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا" (۱۲-۲) ہم نے قرآن کسی اور زبان میں نہیں نہیں کیا عربی میں نازل کیا، صرف اتنے ہی معنی نہیں رکھتا جس قدر اس وقت تک سمجھے گئے ہیں۔ بلکہ ایک بہت زیادہ وسیع اور گہری حقیقت اس میں مضمر ہے۔ تفصیل اس مقام کی مقدمہ میں ملے گی۔"

مگر افسوس مولانا مرحوم کی یہ کتاب مقدمہ تفسیر (باوجود مسودہ تیار ہونے کے، آپ کی وفات کے بعد ضائع ہو گئی) اور شائع نہ ہو سکی اور ہے آں قدح بشکست و آں ساقی نماند والا معاملہ پیش آگیا۔

۷ مولانا عبدہٗ مصری تفسیر "المنار" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"قرآن کی مقناطیسی کشش کس طرح عربوں کو اسلام کی طرف کھینچ کر لاتی تھی۔ یہ صرف ان کے فہم کی باریکی اور لطافت تھی جو ان کو حق کی طرف کھینچنے کا باعث تھی۔"

اس سلسلہ میں وہ ایک اعرابی دوشیزہ کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس نے اپنی ذہانت سے آگے آنے والی آیات کے متعلق یہ معلوم کر لیا تھا کہ یہ آیت، دوامر، دو نہی اور دو بشارتوں پر مشتمل ہے۔

اصمعی جو عربی لغت و ادب کا ماہر اور امام ہے کہتا ہے کہ میں نے ایک بدوی دوشیزہ کی زبان سے یہ اشعار سنے۔

استغفر اللہ لِذنبی کُلّہٖ (ترجمہ) میں اپنے اللہ سے اپنے سارے گناہوں کی بخشش طلب کرتی ہوں
قتلت انسانًا لغیر حِلّہٖ (ترجمہ) میں نے ایک انسان کو ناحق قتل کر دیا۔
مثل غزال ناعم فی دلّہٖ (ترجمہ) اس آہو کی طرح جو اپنے ناز و ادا میں پوری نزاکت رکھتی ہے۔
وانتصف اللیل ولم اصلّہٖ (ترجمہ) رات آدھی ہو چکی اور میں نے ابھی اس رات کی نماز نہیں پڑھی
میں نے یہ سن کر اس سے کہا کہ تیرے اشعار کس قدر بلیغ اور اونچے ہیں۔
دوشیزہ نے جواب دیا تمہارا بھلا ہو۔ کیا تم ان اشعار کو اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مقابلے میں فصیح شمار کرتے ہو۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ٥

(ترجمہ) ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاتی جاؤ۔ جب تمہیں اس کے متعلق خوف پیدا ہو۔ تو اس کو دریا میں ڈال دو۔ نہ خوف کھاؤ نہ غم۔ ہم یقیناً اس کو تمہارے پاس لے آئیں گے۔ اور اس کو نبی بنائیں گے۔

مقام غور ہے کہ ایک ہی آیت میں دو امر، دو نہی اور دو بشارتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اسی ذوق قرآنی سے ہم اعجاز قرآن کی سرحد تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسلام کی بقاء، قرآن کی حفاظت کے بغیر ممکن نہیں۔ (اقتباس از "معارف" دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۵۶ء۔)

۳ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم "تفہیم القرآن" جلد ۵ صفحہ ۱۷۵ پر زیر عنوان "عربی زبان اور قرآن" تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ کتاب (قرآن) عربی زبان کو اس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ ۱۴ صدیاں گزر جانے پر بھی اس کی زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا۔ حالانکہ اتنی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی طویل مدت تک املاء، انشاء، محاورے، قواعدِ زبان اور استعمالِ الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو۔ لیکن یہ صرف قرآن ہی کی طاقت ہے۔ جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہیں دیا۔ اس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہوا۔ اس کا محاورہ آج تک عربی ادب میں مستعمل ہے۔ اس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے۔ تحریر میں آج بھی فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے جو ۱۴ سو برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اس شان کی ہے"؟

اتنا ہے کہ ہمارے صاحب دل اور صاحب حال علماء کرام کے نزدیک تقویٰ کا جو معیار ہے مولانا آزاد اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے اور ان علمائے کرام کے نزدیک امام الہند کے منصب پر فائز شخصیت میں معیاری تقویٰ ضروری ہے دوسرے یہ کہ ان کی رائے میں "امام" ایک ایسی دینی اصطلاح ہے کہ جس کے ہاتھ میں قوت تنفیذ ہونی ضروری ہے۔ اسی لیے جمعیت العلماء کے اجلاس میں مولانا آزاد کو باقاعدہ امام الہندؒ قرار دینے کی تحریک کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہماری ملت اسلامیہ کے بڑے قابل قدر اور نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ پورے عالم اسلام کے لیے بھی قابل قدر ہیں۔ لہٰذا ہمیں دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال حسنہ کی جزا عطا فرمائے۔ ان کی لغزشوں کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت میں مقام علیین پر فائز فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

ڈاکٹر ابصار احمد ڈائرکٹر قرآن اکیڈمی

کی تالیف (بزبان انگریزی) صفحات ۱۶۰

کانٹ اور کرکیگارڈ

ایک تقابلی مطالعہ

عمدہ کاغذ، دلآویز طباعت، قیمت -/۴۰ روپے

ناشر: مکتبہ کارواں، کچہری روڈ، لاہور

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعہ کے ضمن میں ——

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

◎

کتاب کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں چھپ کر آیا ہے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ کتابت ○ دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : ۱۰ روپے

سیرتِ نبویؐ کے ضمن میں دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کی دروس و تقاریر کے دو مجموعے اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ

رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور

فرائضِ دینی اور اسوۂ رسولؐ

سورۂ احزاب رکوع ۳،۲ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیش نظر ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون — ۸۵۲۶۱۱

ذیلی دفتر: ۱۱ داؤد منزل - نزد آرام باغ، کراچی ۱ ۔ فون برائے رابطہ ۲۱۴۷۰۹

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 3 | AUGUST 1984 | No. 6

آپ کے احباب کے لیے :

بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجیے۔

نوٹ

اِس کتابچے کا انگریزی اور عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے ، فارسی ترجمہ زیرِ طباعت ہے ۔ اِس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے !

مرکزی انجمن خدام القرآن —— لاہور

۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن — لاہور

فون